یدِ بیضا

اسلامی و معاشرتی مضامین کا مجموعہ

مصنفہ

خان بہادر علامہ ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری بیرسٹر ایٹ لاء

ملنے

آئین عامہ و فوق ہند و ہسٹری آف لینڈ لارڈس
فنانس و فیشن لائیٹس ان اسلام وغیرہ

مطبوعہ آرمی پریس شملہ

اشاعت اول ۱۹۲۸ء

قیمت عہ (۱)

اِنتساب

میں اس کتاب کو ان مسلمانوں کے نام نامی
سے منسوب کرتا ہوں۔ جو ہماری پستی
سے متاثر ہو کر اتحادِ عمل کی
تدابیر میں سرگرم ہیں

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
۱۴	اسلام اور سرمایہ دار و مزدور	۸۷
۱۵	اسلام اور وطنیت	۹۴
۱۶	واقعات کربلا	۹۹
۱۷	واقعہ کربلا کی اہمیت	۱۰۶
۱۸	اسلام اور عورت	۱۱۰
۱۹	پردہ ہندوستان میں اور اسلام [illegible]	۱۲۰
۲۰	عورت کی حیثیت ہندوستان میں ہندو مسلم ذہنیت کے لحاظ سے	۱۲۸
۲۱	پیام اسلام	۱۳۶

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان	صفحہ
	مقدمہ	
۱	سرزمین عرب اور ظہور اسلام	۱
۲	اسلامی فلسفۂ زندگی	۶
۳	اسلام اور اتحاد	۱۳
۴	اسلام اور عالمگیر مساوات	۲۳
۵	اسلام اور اخلاق	۳۲
۶	نبی کریمؐ بحیثیت ایک انسان کے	۳۶
۷	انسان کامل	۴۲
۸	امن و رحمت کا پیغمبر	۵۱
۹	نبی کریمؐ بحیثیت ایک مصلح عالم کے	۵۷
۱۰	اسوۂ حسنہ	۶۶
۱۱	نبی کریمؐ دنیوی طور سے مبرا تھے	۶۹
۱۲	زندہ جاوید معجزہ	۷۳
۱۳	قرآن منزل من اللہ ہے؟	۷۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

از مصنف

اس کتاب میں اکیس مضامین ہیں جن میں سے بعض تو ایسے ہیں جو اس سے پہلے مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں اور اب کسی قدر زیادتی کے ساتھ درج کتاب کئے گئے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو بالکل نئے ہیں۔ مقصد ان مضامین کا صرف اس قدر ہے کہ مادہ الفاظ میں اسلام کے بعض اصول اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی پاک زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈال کر لوگوں کو مزید اُولیٰ کے اسلام کی طرف متوجہ کیا جائے جو حقیقی صفائی اور سچائی کے ساتھ ایک دریائے نور کی طرح عرب کے سنگلاخ اور ریگستانی گوشہ سے نکلا اور اس نے اپنی بے پناہ روانی سے دنیا کے ہر حصہ کو گھیر لیا۔

اسلام کا بحر مواج جب تک اپنی اصلی حالت میں رہا، نہ خس و خاشاک پہاڑ کے انبار اور موانع کے فلک بوس پہاڑ اس کی روانی کو روک سکے اور نہ دنیا کی ناپاکیاں اُسے منجلاب کر سکیں۔ عیسائی اور دیگر غیر مسلم اقوام اسلام کی اس برق رفتار ترقی سے اس قدر خائف ہوئیں کہ انہوں نے اپنی ساری قوتیں اس کے خلاف نشر و اشاعت میں صرف کر دیں۔ سب سے زیادہ عیسائیوں نے اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کیا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ اسلام اس سرعت سے بڑھ رہا ہے کہ اگر اس کو روکا نہ گیا تو عیسائیت دنیا سے ختم ہو جائیگی تو وہ اوچھے اور ناکام ہتھیاروں پر اُتر آئے۔ کونسا ناپاک سے ناپاک الزام اور بدترین سے بدترین ناجائز اتہام ہے جس کو مسیحی مبلغین و مؤلفین نے اسلام اور پیغمبر اسلام کے سر تھوپنے کی ناپاک کوشش نہیں کی۔ ان تنگ نظروں نے صرف الزامات و اتہامات ہی پر بس نہیں کی بلکہ تبلیسانہ جسارت سے بعض آیات

تصحیح اغلاط

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۹	۵	جس	جس
۱۳	سطر آخری	اس طرح کیگئی ہے	اسطرح ودیعت کیگئی ہے
۱۵	۹	تَخرُجُونَ	تُخرَجُونَ
۳۸	سطر آخری	اسی وقت	اس وقت
۴۴	۱۱	فیھم	فیہ
۴۵	۱۹	اسار	انبار
۴۶	۱۳	حاجتمندوں	حاجتمندوں
۴۷	۲۰	نیکیوں سے اسے	نیکیوں سے
۶۱	۴	قابل انکار	ناقابل انکار
۶۵	۳	زور دیا کہ ہے	زور دیا ہے
۶۸	۱۱	ان قوم اتخذوا	ان قومی اتخذوا
۷۲	۳	ابو بن ریب	عبداللہ بن ابی
۸۷	۸	معاشرتی	معاشی
۸۸	۱۱	متخلفین	مستخلفین

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۹۰	۳	"دشوار ہے" کے بعد یہ عبارت رہگئی ہے۔ "اسلام حق وراثت کو فرزند اکبر کیلئے مخصوص نہیں کرتا جس کو انگریزی میں Law of Primo geniture کہتے ہیں۔"	
۹۳	۵	خدر نار زیبت	خار زار زیست
۹۹	۱۰	وہ ر	وہ
۱۰۳	۲	اپنے بھائی	آپکے بھائی
۱۰۴	۷	پڑے	بڑے
۱۰۷	۳	"اسطرح انہوں نے" اس جملے کے بعد سطرو کی عبارت "اپنا درجہ بہت بلند کرلیا الخ" سطر اول صفحہ "ظلم وتعدی کا شکار رہے الخ" پڑھئے۔ پھر صفحہ کے اس جملے "اہل مدینہ کو جب اس واقعہ کی اطلاع پہنچی" فقرہ بعد صفحہ کی عبارت "امیر علی نے حق کہا ہے الخ" پڑھئے	

سرزمین عرب اور ظہورِ اسلام

اسلامی اعتقادات و اخلاق

جہاں تک میں نے غور کیا ہے آج کل مسلمانوں کی اہم ترین قومی اور مذہبی ضرورت ان کے اعتقادات و اخلاق کی اصلاح ہے۔ اس سلسلہ میں بطور تمہید میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ ملک عرب کی جہالت اور اسلام سے قبل اس کی اخلاقی خرابیوں کے بارے میں بہت کچھ سنا گیا ہے لیکن اس بات پر شاید کم غور کیا گیا ہے کہ پھر اتنے تاریک خطہ کو اس لئے کیوں منتخب کیا گیا کہ اس سرزمین سے ساری دنیا کو امن و اخلاق کا پیام دیا جائے۔ ارتقائی مدارج تمدن کو ماننے والے حضرات اس سے ناواقف نہیں کہ انسان کا ذہنی ارتقاء دنیا میں بتدریج ہوا ہے۔ اور ہمارا یہ دعوے ہے کہ اسلام نے جو پیام پہنچایا وہ انسانی زندگی کی اعلیٰ ترین معراج کا راستہ دکھلانے والا ہے اور انسانی فطرت کی خامیوں اور خوبیوں کو دیکھتے ہوئے اس سے زیادہ مدارج کمال کا حصول ہمارے لئے ناممکنات سے ہے جتنا اسلامی تعلیمات میں بتایا گیا ہے اس لحاظ سے جو قوم اس پیام کو لے کر ساری دنیا میں پھیلانے کے لئے منتخب کی جاتی اس میں بعض ایسی صفات کا ہونا لازمی تھا جو اس کمال انسانی کی صحیح اسپرٹ کو قبول کرنے کی پوری پوری صلاحیت

قرآن کے ایسے غلط تراجم اور مطالب اپنی طرف سے گھڑ کر عوام کے سامنے پیش کئے تاکہ [illegible] بدظن کیا جا سکے۔ قرآن حکیم کی وہ آیات بینات جو [illegible] تعلیم [illegible] کی صحبت [illegible] کو دُنیا پر واضح کرتی تھیں اور جن سے نبی کریم صلعم، قرآن حکیم [illegible] کی کشتی ہدایتی بھیڑیں صراط مستقیم پر آسکتی تھیں ان آیات قرآنی [illegible] آیاتِ الٰہی کے عوض ثمن قلیل کے [illegible] [illegible] کا نا جایا تو یہ کہہ دیا کہ اسلام تعدد ازدواج کی تعلیم دیتا ہے جس سے عورتوں کی حق تلفی ہوتی ہے (حالانکہ اسلام ہی دنیا میں وہ پہلا مذہب ہے جس نے فطرت کے مطابق حقوق نسواں کی نگہداشت اور [illegible] عام لوگوں کو ورغلانا ہوتا تو یہ کہنے لگے کہ اسلام [illegible] ہے [illegible] چند اصول اخذ کر لئے ہیں اور قرآن کی وہ آیات [illegible] کوئی نیا دین نہیں ہے بلکہ وہی قدیم دینِ فطرت ہے [illegible] تمام انبیاء [illegible] عمل کرتے چلے آئے ہیں جس تعلیم الٰہی کو انسان کی نفس پرستیوں نے [illegible] وحقیقت نمایاں کرنے کے لئے آیا ہے۔

دوسری غیر مسلم اقوام نے بھی اسی طرح کی غلط بیانیوں اور افترا پردازیوں سے کام لیا [illegible] توحید پر بڑا فخر ہے، لیکن یہ کیسی توحید ہے کہ کلمہ [illegible] لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کو بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ مگر یہ نہ سمجھے کہ محمد الرسول اللہ [illegible] کا ذکر کرنے سے توحید [illegible] ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کا منشا تو صرف یہ ہے کہ دوسری قوموں کی طرح مسلمان بھی اپنے نبی کو [illegible] نہ سمجھنے لگیں۔ کسی نے یہ اعتراض کیا [illegible] یہ کیسی توحید ہے کہ حجرِ اسود [illegible] قرار دیتی ہے۔ مگر انہوں نے اس حقیقت سے [illegible] قرآن کی [illegible]

اسلام کا یہ تخیل ہرگز نہیں کہ حجرِ اسود [illegible] آپ کی [illegible] سے نکالا گیا تو اس پتھر سے وابستہ کر کے زمین پر اتار دیا گیا۔ یا اسی قسم کی کوئی اور عظمت و خصوصیت [illegible] اس پتھر سے متعلق پیش نہیں کی۔ قرآن کریم میں تو کہیں اس کا ذکر تک بھی نہیں [illegible]

اور جو قوم دنیا میں پھیلکر حق و صداقت کا پیام پہنچانیوالی ہو اس کے لئے یہ صفت ضروری ہے۔

یہ شجاعت محض جسمانی نہ تھی بلکہ وہ دل کے بھی بہادر تھے۔ سچی بات کہنے میں انھیں مطلق دریغ نہ ہوتا تھا۔ وہ یا تو کھلے دشمن ہوتے تھے یا کھلے دوست، درمیانی درجہ سے عرب کی قوم عموماً اور طبعاً ناآشنا تھی۔ تاریکی میں روشنی پھیلانے اور طاقتور اقوام کو حق و صداقت کا پیام سنانے کے لئے جس گروہ کی ضرورت تھی وہ عرب قوم کے سوا کسی اور قوم میں اُس وقت نہیں مل سکتا تھا۔

ایک اور اعلیٰ صفت اس وقت کی عرب قوم میں یہ تھی کہ وہ طبعاً علمی اور علمیت پسند تھے اور اہل ایران و اہل ہند کی طرح محض تخیل پسند، خیال آرا اور نظریہ باز نہ تھے۔ ایک علمی مذہب کی تشریع و تبلیغ کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی اور قوم موزوں نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ چند ہی سال کی تاریخ نے ثابت کر دیا کہ یہ انتخاب کتنا معقول اور موزون تھا۔

اس تمہید کے بعد اب میں یہ دعوےٰ کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام نے جن عقاید کی تبلیغ کی اُن کا اثر براہ راست انسان کی خلقی صفات کی استواری اور بلندی پر پڑتا ہے اس لئے کہ ان عقاید میں صحیح فطرت انسانی کی جس طرح ترجمانی کی گئی ہے کسی اور مروجہ مذہب میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز جو نظر آتی ہے وہ اسلامی توحید کا عقیدہ ہے۔ جو مسئلہ مساوات کی اصل بنیاد ہے۔ اسلامی توحید کا تخیل اتنا بلند ہے کہ اللہ کی اس صفت میں کسی غیر اللہ کی ادنیٰ ترین شرکت بھی گوارا نہیں۔ چنانچہ خود نبی کریم بار بار اس کی تاکید فرماتے تھے کہ آپکا رتبہ بحیثیت انسان کے وہی ہے جو دوسرے انسانوں کا اور خدا کی کسی صفت میں آپ کی مطلق شرکت نہیں ہے۔ کلام پاک کی متعدد آیتوں میں اس نکتہ کو وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اور آپ کی زندگی کے مختلف واقعات اس پر دال ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آپ کو ایک شخص نے مخاطب کیا کہ" اے ہمارے آقا اور ہمارے آقا کے فرزند اور ہم میں سب سے بہتر اور سب

رکھتی ہو اور اس معیار پر ہم اس وقت کی موجودہ اقوام کو جانچتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عرب قوم سے زیادہ کسی میں اس پیام کا حامل ہونے کی اہلیت نہ تھی۔ اس نکتہ کی شرح کے لئے اس زمانہ کی عرب قوم کی بعض خصوصیات کا سمجھنا ضروری ہے۔

سب سے بڑی خصوصیت اس زمانہ کی عرب قوم میں یہ تھی کہ باوجود نوشت و خواند سے عاری ہونے کے وہ عموماً عقل و دانش سے بہرہ ور اور نہایت ذہین و طباع تھی چنانچہ علم و سیاست کے اُلجھے سے اُلجھے مسئلہ کو سلجھانا اور غیر عرب اقوام سے خصوصاً روم و ایران کی متمدن اقوام سے تعلقات پیدا کرنا شعر و شاعری میں جوش و ولولہ اور صداقت و حقیقت کے جوہر نمایاں کرنا ایسے صفات ہیں جن سے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے ـــــ اہل عرب کے حافظہ کی تو یہ حالت تھی کہ عربی شعراء اپنے بڑے بڑے قصائد زبانی پڑھتے تھے اور جو کہتے تھے برزبان یاد رکھتے تھے، چنانچہ یہی روایات کلام پاک کے بالفاظہٖ محفوظ رکھنے میں منجملہ دیگر اسباب کے کارفرما رہے اور عرب قوم کی اسی صفت نے اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ کے دعویٰ کو بیّن شواہد سے صحیح کر دکھایا۔

ایک اور صفت ان کی فیاضی تھی جس میں مہمان نوازی اور ہمسایوں اور پناہ گزینوں کی امداد میں اپنی جان تک لڑا دینے میں تأمل نہ ہوتا، اپنی ساری املاک کو دعوت احباب و حسن سلوک میں صرف کر دیتے تھے اسی صفت نے اسلامی صدقات و خیرات کے نظریہ کو عمل میں انتہائی کمال تک پہنچایا۔ حتیٰ کہ صحابہ کرام اپنا سارا اثاثہ خدمت دین و امداد مساکین میں صرف کر دینا باعثِ فخر سمجھتے تھے اور اس میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی خودداری کا جذبہ بیدار تھا وہ غلام بننا نہیں جانتے تھے اور بڑے سے بڑے شخص کے سامنے بے باکانہ بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ ظاہر ہے اسلامی اخوت و مساوات کی کاشت کے لئے اس سے بہتر اور کوئی زمین نہیں مل سکتی تھی۔

ایک اور صفت ان میں شجاعت کی تھی جس سے وہ خطرات کو خاطر میں نہ لاتے تھے

اسلامی جماعت اور حج وغیرہ کے اعمال وحدت الٰہی اور کامل انسانی مساوات کا مظہر ہیں اور ان سے بار بار مسلمانوں کو یاد دلایا جاتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں انسانوں کی حیثیت و فرقہ وغیرہ کا کوئی امتیاز نہیں اور اگر کوئی امتیاز ہے تو وہ پاکبازی کی زندگی کا ہے۔ جس میں مسلمانوں کو ایک دوسرے پر مسابقت کی کوشش کرنی چاہیئے۔

یہ پاکبازی کی زندگی کیا ہے۔ خدا اور خلق کی خدمت، عام انسانی ہمدردی، رحم و سخاوت کا سلوک، وعدہ کا ایفاء، چوری، تغلب اور رشوت سے احتراز، نیک معاشی اور نیک اندیشی۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان صفات میں مسابقت کی کوشش انسانی سوسائٹی کو کس اعلیٰ و ارفع درجہ پر پہنچا سکتی ہے۔

غرضکہ اسلام ایک مسلمان سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ عالم انسانیت کے تمام دانوں کو تسبیح وحدت کے رشتہ میں پرو دے گا۔ وہ خدا کی تمام مخلوق کے ساتھ بلا لحاظ ملک و ملت عدل و انصاف کا سلوک کرے گا۔ وہ اپنی روزانہ زندگی میں نبی کریم کے اسوۂ حسنہ کو اپنا مشعل راہ بنائیگا اور اس آیتہ پر نظر رکھیگا کہ

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

وہ تمام نسل انسانی کو ایک معیار پر لانے کی کوشش کرے گا۔ وہ مسلمانوں کے درمیان سچی مواخاۃ پیدا کرے گا اور اس ارشاد ربانی کو اپنا دستور العمل بنائیگا کہ

انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم

وہ دولت اس لئے نہیں حاصل کرے گا کہ عیش و عشرت پر خرچ کرے بلکہ اس سے اوروں کو فائدہ پہنچائے۔

سے بہتر کے فرزند" آپ نے فرمایا کہ " لوگو! پرہیزگاری اختیار کرو، شیطان نہیں گمراہ کرے میں عبداللہ کا بیٹا محمدؐ ہوں۔ خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، مجھ کو خدا نے جو مرتبہ بخشا ہے مجھے پسند نہیں کہ مجھے اس سے زیادہ بڑھاؤ۔" (مسند ابن حنبل) اسی طرح جو عامر کا وفد جب آپ کی خدمت میں آیا تو لوگوں نے عرض کی کہ آپ ہمارے سید (آقا) ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ سید خدا ہے۔

جب یہ عقیدہ قلب و دماغ پر پوری طرح مستولی ہو جائے کہ بزرگی اور برتری صرف خدا کے لئے ہے اور باقی انسان ایک دوسرے کے برابر ہیں تو پھر انسانوں میں تفریق کا سوال جاتا رہتا ہے اور کامل مساوات انسانی کا درجہ قائم ہو جاتا ہے۔ یہی انسان کے ذہنی ارتقاء کا معراج کمال ہے۔ آج اس مساوات پر غیر اسلامی تمدن کے سیکڑوں پردے پڑ جانے کے باوجود بھی جس وقت ایک مسلمان اسلامی تعلیمات پر توجہ کرتا ہے تو اس کی نظر سے سارے امتیازات مٹ جاتے ہیں اور وہ معاشرت میں دوسروں سے سلوک کے وقت یا حق و صداقت کے اظہار کے وقت کسی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتا۔ نہ دوسرے کو اپنے سے کمتر سمجھتا ہے اور نہ اپنے کو دوسروں سے کمتر۔ کیا آپ کوئی ایسا نظریۂ تمدن پیش کر سکتے ہیں جو علوے اخلاق و شرافت کی صفات پیدا کرنے میں اس سے زیادہ موثر اور اس سے زیادہ کارآمد ہو؟

اسی عقیدہ وحدت کے نتائج غریبوں کی دستگیری یتیموں کی پرورش، کمزوروں کی امداد، صنف ضعیف کے رتبہ کو بلند کرنے اور غلاموں کو آزاد کرنے کی مساعی ہیں۔ اور خیرات اور صلہ رحم کے ساتھ ملکر یہ صفات ایسی اعلیٰ صفات انسانی بن جاتی ہیں کہ کسی انسان کا تخیل اس سے زیادہ بلندی پر نہیں پہنچ سکتا۔

اسی وحدت سے وہ رواداری کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے جس نے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کو تمام غیر مسلم اقوام میں ممتاز و محبوب بنا دیا تھا۔ اسلام کے معترضین جو چاہیں کہیں لیکن اس تاریخی حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام کی تبلیغ جتنی رواداری اور ہمدردی انسانی کے اظہار سے ہوئی اتنی جنگی فتوحات اور ملک گیری سے نہیں ہوئی۔

بار بار کہتا ہے کہ قدرت یا نیچر خداوند کریم کی مظہر ہے۔ اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زندگی اور اس کے مسائل پر امتحان و آزمائش کی نظر ڈالتا ہے۔ اسلام کی تعلیم اور اس کے احکام جسم و رُوح میں توازن برقرار رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ اسلام ہمیں حقائق سے دوچار ہونے اور مخالف حالات سے حوصلہ پست نہ کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ جملہ دنیوی مسائل کی جو تشریح و تحلیل قرآن کریم میں کی گئی ہے اس سے ہمارے ذہن و دماغ کو ایسی ہی سچی مسرت حاصل ہوتی ہے جیسی کہ ایک سائنسدان کو کسی معمل میں طبعیات و کیمیا کے مسائل حل کرنے سے ہوتی ہے۔ زندگی کا جائزہ عملی نقطۂ نظر سے لینے کے مقصد کو عام طور پر رائج کر دینے میں نبی کریم کو اس وجہ سے اور بھی تقویت پہنچی کہ جوش عمل اہل عرب کے خصوصیات میں سے ہے۔ یہاں تک کہ ان کی شاعری بھی جو ایک ذہنی چیز ہے خیالی سے زیادہ عملی ہے۔

قریب قریب تمام دوسرے مذاہب کی طرح اسلام کی رُوح میں بھی جسمانی، سیاسی اور معاشرتی اثرات کارفرما تھے۔ قرآن کریم جو اسلامی تعلیم و تہذیب کا سرچشمہ ہے خیال سے زیادہ عمل پر زور دیتا ہے۔ اور اس طرح حقائق و واقعات عالم سے دوچار ہونے کی ترغیب دیتا ہے۔ ایک ایسے زمانہ میں جب کہ دیکھی سے زیادہ اَن دیکھی چیزوں پر لوگوں کا اعتقاد تھا نبی کریم نے اَن دیکھی سے زیادہ دیکھی برتی، اور جانی بوجھی چیزوں پر زور دیکر ایک ذہنی انقلاب پیدا کر دیا۔ غالباً یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ خیال کی دنیا میں یہ رجحان پیدا کر کے اسلام نے آزادیٔ خیال کی بنیاد رکھی جس سے دنیا کا عہد جدید ظہور میں آیا۔ لوگوں کو یہ تعلیم دے کر کہ قدرت خدا کی مظہر ہے اسلام نے انسان اور خدا کی ذات کے درمیان ایک ربط پیدا کر دیا۔ یہی عقیدہ یا ایمان تھا جس نے انسان کو دنیاوی واقعات و حالات کی تحقیق کا شیدائی بنا دیا۔

قدرت کی حقیقت سمجھنے اور اس کا علم حاصل کرنے کا جذبہ ہمارے لئے ذاتِ خدا سے قرب حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بن گیا۔ اس زمانے کے لوگوں کا یہی ذہنی انقلاب تھا جسے دیکھ کر مشہور جرمن مفکر گوئٹے نے کہا تھا "دیکھو، یہ تعلیم کبھی ناکام نہیں ہو سکتی۔ دنیا کے رسم و رواج کو دیکھتے ہوئے یہ

اسلامی فلسفۂ زندگی

فلسفہ کا مقصد اشیاء و حالات کا عقل و ادراک کے ماتحت جائزہ لینا ہے۔ زندگی کو سمجھنے اور پرکھنے کی ہر کوشش اس مقصد میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ ضمیر بہت بڑا رہبر ہے، اور اسلام اپنے پیروؤں کو اس کی آواز پر لبیک کہنے کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن کریم میں بار بار ارشاد ہوتا ہے "افلا یتدبرون۔ افلا یتفکرون۔ افلا تعقلون"

اسلامی فلسفۂ زندگی سے ہمارا مطلب اسلام کے ان احکامات پر غور کرنا ہے جنہیں ہمارا ذہن بھی قبول کرتا ہے اور جو ہماری روزمرہ کی زندگی کے لئے بھی مفید ہیں۔ مثلاً یہ دیکھنا کہ اسلام خدا اور دُنیا کے ساتھ ہمارے تعلق، ضمیر کی آزادی، ایمان و عمل، قدرت اور خدا اور خودی اور ذات باری کی بابت کیا تعلیم دیتا ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جن پر ہر زمانے کے فلسفیوں اور مفکروں نے غور کیا مگر ان کے حل سے قاصر رہے اور سائنس بھی جس سے امید کی جاتی تھی کہ اس مادی دنیا کے رازہائے سربستہ کے چہرے سے نقاب اُٹھا کر رہیگی ان سوالات کے صحیح حل سے اب تک کوسوں دُور ہے۔ مگر ان تمام سوالات کا بہترین جواب نبی کریم حضرت محمد صلعم نے پیش کیا۔ جنہوں نے خدا کے سمجھنے کیلئے دنیوی مسائل کو سمجھنے اور برتنے کو ناگزیر فرمایا۔ چنانچہ قرآن کریم

چند دیگر مناسک حج کو بیان کرتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حجرِ اسود کعبہ کی اوّلین تعمیر کا ایک یادگار پتھر ہے تعمیر ابراہیمی کے وقت حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہم السلام نے اس پر کھڑے ہو کر کعبہ کی تعمیر کی تھی اور متعدد مرتبہ کعبہ کی ویرانی کے بعد حضرت پیغمبر اسلام علیہ السلام کے زمانہ تک یہ پتھر محفوظ اور صحیح سالم تھا اسلئے قریش مکہ کی تعمیر کعبہ کے بعد اس یادگار پتھر کو ایک ایسے موقعہ پر نصب کر دیا گیا کہ بیت المقدس کا رُخ بھی معدوم ہو جائے اور اس کی نمایاں سیاہی سے یہ فائدہ بھی حاصل ہو کہ طواف کرنیوالے آسانی سے اپنے آغاز طواف کے مقام کو پہچان سکیں اور انہیں یاد رہے کہ ہمارا آغاز طواف اس جگہ سے ہوا تھا۔ اسکے استلام میں بھی یہی ایک مصلحت ہے مسلمان نہ اس میں کوئی کرامت مانتے ہیں، نہ کوئی غیبی طاقت بلکہ خانہ کعبہ کی اوّلین بنیاد اور تعمیر خلیل اللّٰہی اور دورِ اسلامی کی تعمیر کی ایک یادگار باقی سمجھتے ہیں اور بس۔ اگر اسکا استلام نہ ہو سکے تو ارکان حج میں کوئی نقصان نہیں آتا۔ صرف اسکے مقابل آکر اشارہ کر دینا تکمیل طواف کیلئے کافی ہے۔ لیکن مخالفین اسلام نے اتنی سی بات کا ایک فسانہ بنا دیا جو محض اسلام سے عناد کا اظہار رہے۔

غرض ایک طرف تو مخالفین اسلام کے یہ غلط پروپیگنڈے زور شور سے جاری تھے اور دوسری طرف خود مسلمانوں کی نافہمیوں اور خود غرضیوں نے اسلام کی قوت کو ضعف پہنچایا۔ سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ چند فرقے بھی نمودار ہونے پائے تھے کہ مسلمانوں میں پارٹی بندیاں شروع ہو گئیں اور ہر پارٹی نے اپنی تقویت اور اغراض صداقت کیلئے پیغمبر احادیث کا انبار لگا دیا ان مختلف فرقوں میں جو احادیث موضوعہ جاری ہیں اگر انکی تشریح و جرح کی جائے تو ان احادیث کا رد بھی احادیث ہی سے ملتا ہے۔

ارباب فکر و نظر سمجھ سکتے ہیں کہ ایک پیغمبر برحق کے کلام میں تضاد عقل و درایت کے خلاف بلکہ محال ہے ہر چند کہ نیک نیت محدثین نے تطبیق احادیث اور تحقیق رجال کی سعی جمیل کے بعد معیار صحت مقرر کیا ہے لیکن اُسے کامیاب سمجھنا مشکل ہے اسلئے کہ آج جبکہ وسیع ذرائع تفتیش کے باوجود پولیس کے تجربہ کار مفتشین کو کسی شخص کے نفہ و غیر ثقہ ہونے کی جانچ میں سخت دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے اور پھر بھی یقینی نتیجہ پر نہیں پہنچتے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس دور کے علماء جو عموماً حسن ظن کے بھی عادی تھے کثیر التعداد راویان حدیث کی ثقاہت و عدم ثقاہت کی جانچ میں کہاں تک کامیاب ہو سکتے ہیں اس لئے احادیث کا معیار صداقت صرف یہی ہو سکتا ہے کہ تعلیم و مفاہیم قرآن سے مطابق اسکی مؤید یا شارح و مفسر ہوں اصول درایت صحیح آئین اور واقعیت کے خلاف نہ ہوں۔ ذاتیات کی بحث فرقہ وارانہ جذبات اور رجال پرستی کے خیالات سے بالکل پاک ہوں کہ ایک نبی برحق کے کلام کی یہی شان

کہنا پڑے گا کہ ہم کیا کوئی بھی اس سے آگے نہیں جا سکتا۔

اسلام کے ظہور میں آنے سے قبل بیسیوں سے مذہبوں کا بنیادی اصول یہ تھا کہ ؏

عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے!

اس لئے ان مذہبوں نے ترک دُنیا کی تعلیم دی۔ مگر یہ اسلام ہی تھا جس نے اس خیال کے تدارک کے ساتھ ساتھ خدائی وحدانیت کا تصور پیدا کیا۔ اس نے بتایا کہ دنیا اور خدا دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ دنیا اور خدا ایک تصویر کے دو رُخ ہیں اور یہ کہ دنیا کا قیام و وجود خدا کی ذات کو پہچاننے اور تسلیم کرنے ہی کے لئے عمل میں آیا ہے غالبؔ نے کیا خوب کہا ہے ؏

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں

قرآن کریم صاف صاف کہتا ہے :-

وما خلقنا السمٰوٰت والارض وما بینھما لٰعبین ، ما خلقنٰھما الا بالحق ولٰکن اکثرھم لا یعلمون ۔

قرآن کریم نے موسم کی تبدیلیوں، رات دن کی ترتیب، ستاروں کی روشنی اور شہد کی مکھیوں کی بھٹکنا ہٹ کی طرف توجہ دلائی۔ لوگوں کو یقین دلایا کہ دنیا کے متعلق "مایا" اور فریب کے سب خیالات سوسائٹی کی ذہنی ترقی کے لئے غیر مفید ثابت ہوں گے۔ کیونکہ ان کے سبب سے لوگ قدرت کے رازہائے سربستہ کے تحقیق و عرفان اور خدمتِ خلق کی طرف مائل نہیں ہو سکتے۔ اس نفسی انقلاب نے لوگوں میں چیزوں کی قدر و قیمت کا ایک نیا معیار پیدا کر دیا۔ وہ خیال سے زیادہ عمل پر زور دینے لگے اور ان کے دل سے یہ خیال دور ہو گیا کہ علم الاخلاق انھیں تنگ نظر بنائے دے رہا تھا جس کی بنا پر وہ بڑے بڑے قلعوں کو

مانا جائے تو ذہن اسی طرف جاتا ہے کہ وہ بات لین دین کی کوئی ایسی صورت ہوگی جس میں بظاہر ربا کی مشابہت پائی جاتی ہوگی اور آیات ربا کے نزول کے بعد اسکے خلاف عملی کارروائی ضرور کی گئی ہوگی ۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ احکام قرآنی کے خلاف کوئی عمل جاری ہو اور نبی کریم صلعم اُس پر توجہ نہ فرمائیں ۔ لیکن اس حدیث کے وجود سے اہل غرض کے خیالات کی تقویت ہوئی اور وہ ربا کی مختلف صورتوں کے بیچ میں پڑ کر رہ گئے ۔ ایک طبقہ ربا کی مطلقاً حرمت بیان کرتا ہے مگر ایک دوسرا طبقہ کہتا ہے کہ قبل اسلام روپیہ کے استعمال کی دو صورتیں عام طور پر رائج تھیں ایک تو یہ کہ اُسکے منافع کی کوئی معینہ حد نہیں تھی یعنی سود بالائے سود کا غیر متناہی سلسلہ جو قرضدار کو تباہ و برباد کر دیتا تھا جس کو انگریزی میں (USURY) یوژری کہتے ہیں ۔ دوسرا ایسا منافع جیسے آٹے میں نمک جس کو انگریزی میں انٹرسٹ یعنی منافع کہتے ہیں اور جس کی موجودہ تمدن میں اتنی شکلیں پائی جاتی ہیں کہ قدیم تمدن یا اسلامی تمدن کے آغاز میں ان کا کوئی وجود نہیں تھا ۔ پہلی صورت (usury) یوژری (بہت زیادہ سود لینا) اسلام سے پہلے بھی بُری اور ناجائز سمجھی گئی اور تقریباً تمام انبیاء رسالیفین نے اُسکے خلاف تنبیہ کی ہے حتیٰ کہ قدیم ہندوستانی مذہب بھی اُس کی ممانعت کرتا ہے ۔ لیکن دوسری صورت انٹرسٹ (Interest) یعنی نفع یا سود قلیل کی ان مذاہب قدیمہ میں ممانعت نہیں تھی اور یہی مفہوم طبقہ حرمت ربا سے متعلق آیات قرآنی کا بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ سود کثیر کی بے شک ممانعت ہے ۔ لیکن قلیل ترین نفع جیسے بنکوں اور لمیٹڈ تجارتی کمپنیوں کی طرف سے دیا جاتا ہے اسکی ممانعت قرآن کریم سے ثابت نہیں ۔ اس طبقہ کے نزدیک الذین یاکلون الربا ۔ الخ اور احل اللہ البیع وحرم الربٰوا سے وہی ربا یعنی اضعافاً مضاعفاً مراد ہے ۔ مطلقاً یعنی قلیل ترین منافع مقررہ کی ممانعت نہیں اسلئے کہ آیتیں لا تاکلوا الربا اضعافاً مضاعفاً کے تحت فرمائی گئی ہیں اور ان میں سود کثیر کھانے والوں کا انجام اور انکی حالت بتا کر اُن کے اس غلط خیال کی تردید کی گئی ہے جو انہوں نے (انما البیع مثل الربٰوا) کہہ کر ظاہر کیا ہے ۔ قرآن کریم اُن کے اسی نظریہ کو باطل قرار دیتا ہے کہ بیع اور ربا (یعنی سود کثیر) یکساں نہیں ہیں ۔ اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالےٰ بیع کو حلال

ہونی چاہیئے حقیقت یہ ہے کہ خاص نبی کریم صلعم کی صحیح احادیث اس شان کی مظہر ہیں۔ لیکن افسوس کہ خود غرض لوگوں یا سادہ دل مسلمانوں نے ہر اُس قول کو جو حدیث کے نام سے مشہور کر دیا گیا، قول رسول سمجھ کر قرآن کا ہمپایہ بلکہ معاذ اللہ قرآن کا ناسخ تک قرار دیدیا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام کی صحیح تعلیم کی بے داغ صورت کہاں تک مسخ ہو سکتی تھی۔ اس تمام خرابی کی ذمہ داری ہمارے علمائے کرام کی غیر معتدل خوش اعتقادی ہے اور نا روا حسن ظن۔ ورنہ اسکے کیا معنی کہ ہزار بارہ سو سال کی مدت مدید گزر جانے کے باوجود قرآن اصول قرآن۔ اور تعلیم و مفاہیم قرآن کو پیش نظر رکھ کر احادیث کی جانچ پڑتال اور تاریخ و درایت سے مطابقت کرتے ہوئے صحیح حدیثوں کا انتخاب نہیں کیا گیا، اور آج تک وہ خلاف قیاس اور موضوع حدیثیں ہمارا دستور العمل بنی ہوئی ہیں۔ کاش علمائے اسلام کو اب بھی احساس ہو کہ اُن کے اس طرز عمل سے بیقرار ہو کر اسلام زبان حال سے فریاد کر رہا ہے کہ ع "شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیرہا"

بسلسلہ مشکلات حدیث میں ایک حدیث پر اظہار حیرت کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حضرت عمرؓ کیطرف سے یہ حدیث روایت کی جاتی ہے کہ جب ربا کے متعلق اُن سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہی ایک چیز ہے جس کو میں نبی کریم صلعم سے پوچھنا بھول گیا"۔ غور کیجئے کہ جب ربا کے یہ آیتیں نازل ہوئیں کہ نہ سود در سود لو نہ مطلق ربا حاصل کرو۔ اسلئے کہ خدا نے ربا کو حرام کر دیا ہے اور بیع کو حلال کیا ہے۔ بیع و ربا ہرگز ایک دوسرے کے مماثل نہیں۔ تم لوگوں کے ذمہ بقیہ ربا کو چھوڑ دیجئے اور آئندہ کے لئے ربا سے توبہ کر کے صرف اپنی اصلی رقم قرضداروں سے وصول کرو نہ تم کسی کا نقصان کرو نہ تمہارا کوئی نقصان کرے۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو اللہ اور اُسکے رسول سے لڑنے کے لیئے ہوشیار ہو جاؤ۔ ظاہر ہے کہ ان آیات میں مطلق ربا اور دو چند سہ چند ربا کی حرمت بیان کی گئی ہے۔ بیع و ربا کی مماثلت کے خیال اور عقیدہ کو باطل کیا گیا ہے۔ بقیہ ربا کے چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ لا تظلمون ولا تظلمون سے اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ نہ ربا لیا جائے اور نہ دیا جائے۔ ان آیات میں احکام ربا مکمل اور واضح طور پر بیان کر دیئے گئے ہیں جن میں کوئی پیچیدگی اور خفا نہیں ہے پھر وہ کونسی بات ہے جس کو حضرت عمرؓ نبی کریم سے پوچھنا بھول گئے اور سائل کو اُس کے دریافت کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اگر اس روایت کو صحیح

جاری تھیں البتہ جن میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی تھی اسلام نے اُن کی اصلاح کر دی۔ ختنہ کی رسم مصریوں سے بنی اسرائیل میں آئی تھی اور جس کو حضرت ابراہیمؑ نے بھی اپنی قوم میں جاری رکھا اس رسم کی تاریخ یوں بیان کی جاتی ہے کہ مصر میں پہلے دیوتاؤں کی نذر جانیں کی جاتی تھیں جس کی اصلاح بعض مصلحین نے اس طرح کی کہ انسان کے جسم کا ایک خاص حصہ جو نہایت اہم ہے اُس کا ایک فاضل جزو کاٹ کر دیوتاؤں کی نذر کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ طریقہ بحد ازاں ختنہ کی شکل میں رواج پذیر ہو گیا اور جس کو ملت ابراہیمی میں بھی قبولیت عامہ حاصل ہوئی۔ قطع نظر اسباب ابتدار کے چونکہ یہ طریقہ اصول حفظان صحت کے عین مطابق تھا اور جس کے مفید ہونے کو آج محققین حکماء و فلاسفہ اور ڈاکٹروں نے تسلیم کر لیا ہے۔ پیغمبر علیہ السلام نے بھی اسکو اسلام میں جاری رکھا۔ بہرحال اسلام میں قدیم مذاہب اور تمدنوں کی بہت سی ایسی باتیں موجود ہیں جو خلاف عقل و فطرت نہیں اور اُن میں کوئی شائبہ شرک نہیں پایا جاتا۔ اس بنا پر دوسرے تمدن یا معاشرت کی وہ چیزیں جو فی نفسہٖ اچھی اور مستحسن ہوں اور اُن کے قبول کرنے سے اصول اسلام پر کوئی اثر نہ پڑتا ہو، اُن کے قبول کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔ لیکن اس امر میں "خذ ما صفا دع ما کدر" کے زرین اصول کو کامل دقت نظر سے ملحوظ رکھنا ہمارا اولین فرض ہے۔ بدقسمتی سے مسلمانوں نے دوسرے تمدنوں کے اثرات قبول کرنے میں زیادہ تر اس کے خلاف عملدرآمد کیا ہے۔ یعنی ع

"ما صفا کو چھوڑ بیٹھے مَا کدر کو لیا"

قرآن کی صاف اور سچی تعلیم سے چشم پوشی کرنے کا ایک اور تباہ کن نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے غیر مسلم اقوام کے اکثر عقاید کو اسلامی عقاید میں شامل کر لیا مثلاً جس طرح ہندو اپنے پیشواؤں کو خدا کا اوتار اور مسیحی حضرت عیسےٰؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں مسلمانوں کے ایک فرقہ نے حضرت علیؓ کو خدا کا مظہر، بلکہ خدا تک کہہ دیا، کیا یہ افراط کی انتہائی مثال نہیں؟ نبی کریم علیہ التسلیم کے مراتب اور نعت میں جس طرح غلو کیا جاتا ہے وہ کچھ کم توحید شکن نہیں، حالانکہ قرآن حکیم اور صحیح احادیث نبی کریم میں رسول اکرم صلعم کی ذات و صفات اور دیگر برگزیدہ ہستیوں کے حالات میں غلو کرنے کی کس درجہ ممانعت اور افراط سے بچنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ نبی کریم صلعم کی بیمثل فضلیت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے مگر اس کے باوجود آپ ایک بشر اور خدا کے پیغمبر ہیں۔

اور "ربا" کو حرام نہ ٹھہراتا۔ چنانچہ اسی نقطۂ نظر کی بنا پر بعض بنکوں کے پینیوں کے سود (منافع) کو قطعاً جائز سمجھنا اور وصول کرتا ہے۔ لیکن جو لوگ اس مفہوم کو نہیں مانتے اُن کی حالت یہ ہے کہ اپنی ضروریات سے مجبور ہو کر مہاجنوں سے بھاری سود پر قرض لیتے اور اکثر حالات میں اصلی رقم سے بدرجہا زائد رقم سود میں دیدیتے ہیں، جن سے مہاجنوں کے پاس دولت کے انبار جمع ہوتے ہیں، اُن کے سند رتعمیر ہوتے ہیں اسلام کے خلاف تبلیغی مشنری اور لٹریچر تیار ہوتے ہیں۔ شرک و بت پرستی کو فروغ ہوتا ہے اور اُن کی قومی حالت قوی سے قوی تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور اگر سود کو مطلقاً حرام سمجھنے والے یا حیثیت مسلمانوں کا روپیہ بنظر احتیاط و حفاظت بنکوں میں جمع ہوتا ہے تو اُسکا سود یعنی منافع لیتے نہیں بلکہ بنک ہی کو چھوڑ دیتے ہیں جو بنکوں کی طرف سے مسیحی اداروں کو دیا جاتا ہے جس سے وہ کلیسا تعمیر کرتے مسلمانوں اور دیگر قوموں کے لوگوں کو عیسائی بنانے کے لئے مشن قائم کرتے ہیں اور اس طرح گویا مسلمانوں ہی کی مالی امداد سے اسلام کے خلاف محاذات جنگ و مقابلہ قائم ہوتے ہیں۔ غرض اس مسئلہ کے پیچیدہ پہلوؤں کو پوری طرح نہ سلجھانے کی وجہ سے مسلمان ان کبیرہ گناہوں کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں اور اُن کو کس کس طرح روحانی و جسمانی، مذہبی و اقتصادی اور مالی و معاشی نقصانات پہنچ رہے ہیں۔ کیا یہ اسی کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارے علمار کرام نے خالص قرآنی روشنی میں اس مسئلہ کو پوری طرح حل کرنے کی کوشش نہیں فرمائی، ضرورت تھی کہ علمار محققین کی جماعت اس مسئلہ کے ہر پہلو پر غور فرما کر ایک ایسا حل تلاش کرتی جو مسلمانوں کے لئے مفید اور نقصانات سے محفوظ رکھنے والا ہوتا۔

ایک اور نقصان اسلام کو مسلمانوں کے اپنے تمدن کی عدم حفاظت سے پہنچا، اس طرح مسلمانوں پر دوسرے تمدنوں کا ایسا اثر پڑا کہ وہ اُسی رنگ کو قبول کرتے چلے گئے یہاں تک کہ دوسرے تمدنوں کی بہت سی چیزیں جزو مذہب بن گئیں۔ مثلاً ولادت و وفات اور شادی وغیرہ کے بعض رسوم ایسے ہیں جو اکثر یہودیوں اور ہندوؤں میں جاری تھے۔ قبروں پر آج جو کچھ ہوتا ہے کیا یہ غیر مسلم اقوام کی نقل نہیں؟ میں یہ نہیں کہتا کہ دوسرے تمدن کی کوئی چیز بھی اختیار کرنا اسلام کے خلاف ہے۔ اسلام میں ابتدا سے بہت سی چیزیں ایسی موجود ہیں جو قدیم تمدن و معاشرت کا جزو تھیں۔ حج کی بہت سی رسمیں وہی ہیں جو قبل اسلام

زندہ اور آسمان پر ہیں۔ اور ان کے اس وقت تک کیا فرائض ہیں۔ اور محمد الرسول اللہ جو افضل الانبیاء ہیں وہ کیوں متوفی اور تہہ خاک ہیں ؟ اور پھر حضرت عیسیٰ کو تو یہ عزت نصیب ہو کہ وہ دوبارہ آئیں اور تمام دنیا ان کی مطیع ہو جائے۔ اور محمد الرسول اللہ نہ دوبارہ آئیں اور نہ تمام عالم اُنکے حلقۂ اطاعت میں آسکے تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ اس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ "الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا" کے اعلان کے بعد تکمیل دین، اتمام نعمت، اور پسندیدگی اسلام میں کسی کمی کے خیال و تصور کی گنجائش بھی پائی جا سکتی ہے۔ کہ کسی دوسرے ہادی و مہدی، یا متمم دین و مطاع عالم کی ضرورت لاحق ہو۔ اس سوال کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ مسیح موعود امتِ محمدیہ کے ایک فرد کی حیثیت سے آئیں گے اور قرآن ہی کی تعلیم دیں گے۔ تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ نبی جس کے لئے رُوح اللہ کہا گیا وہ کس حیثیت سے دوبارہ آنا عروج ہوگا یا نزول؟ غرض یہ وہ تخیلات و عقائد ہیں جن کی بنیاد دیگر مذاہب کے متوہمانہ عقاید پر قائم ہوئی ہے اور اسمیں مخالف اسلام جماعتوں کی خفیہ کارروائیوں کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔ انہیں عقائد ضعیفہ کی یہ کرامات ہیں کہ خیر القرون کے زمانہ مابعد سے لیکر آجتک سینکڑوں مہدی و مسیح موعود نمودار ہو ہو کر صحیح اسلام کے آفتاب درخشاں کی صاف روشنی کو مکدر کر چکے ہیں۔ ان کی شورشوں اور جدال و قتال کے ہولناک کارناموں سے دنیائے اسلام بارہا تاریک ہو ہو کر رہ چکی ہے۔ وحدت اسلام کا مضبوط حلقہ شکست ہو کر اُمت واحدہ سینکڑوں فرقوں میں تقسیم ہو گئی۔ تکفیر و تفسیق کی ناپاک شورش نے امن و سلامتی کے قصر میں ہنگامہ حشر برپا کر دیا۔ اور ملت اسلام کا شیرازہ آج اس طرح بکھرا ہے کہ کسی طرح مجتمع ہونے میں نہیں آتا۔

مادّہ دماغوں کے تخیلات رکیک، ان کی خوابہائے پریشاں، قصہ کہانیاں اور ہرزہ سرائیاں اصول مذہب بن کر رہ گئیں اور اسلام کی رُوح مقدس پیکرانِ اسلام کی موت کے ساتھ پرواز کر گئی۔ انا للہ۔ ہم قطعاً بھول گئے ہیں کہ اسلامی توحید کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا،

لیکن یہ افراط پسند مسلمان خدا و رسول کی شدید ترین تنبیہات و ہدایات کے باوجود غیر مسلم اقوام کے عقاید باطلہ کی تقلید سے باز نہیں آتے۔ اور احادیث موضوعہ و روایات غیر صحیحہ کے طومار اپنے عقیدہ باطلہ کی تائید میں پیش کئے جاتے ہیں، اور یہ محسوس نہیں کرتے کہ ہمارے اس حد سے تجاوز کی بدولت اسلام کی صداقت و حقیقت، اسکی بیتظیر توحید اور مطابقت فطرت پر کس طرح حرف آرہا ہے۔ اللھم اھدنا الصراط المستقیم۔

ایک اور خرابی جس نے اسلام کو سخت نقصان پہنچا رکھا ہے یہ ہے کہ قرآن حکیم کی آیات جن کو قرآن نے بیّنات و مفصلات کہا ہے اور جو تبیانا لکل شئی و تفصیلا لکل شئی اور قرآناً مفصلاً کا اعلان و اظہار کر رہا ہے، اسکی آیات کے معانی میں دیگر مذاہب کی روایات کے زیر اثر ہمارے مفسرین نے تاویلات رکیکہ سے کام لیا۔

مثلاً یہ خیال قدیم سے چلا آتا ہے کہ آخر زمانے میں خدا کے ایک پیغمبر آئینگے اور تمام دنیا اُن کی مطیع و فرماں بردار ہو جائیگی، اس خیال سے عیسائیوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ حضرت عیسٰےؑ دوبارہ آئینگے اور مختلف صورتوں سے پیشینگوئیوں کے رنگ میں اس عقیدہ کی عام اشاعت کی گئی۔ بعض دوسرے مذاہب میں بھی کلجگ کے آخری اوتار کی پیشینگوئیاں موجود ہیں۔ ان خیالات و عقاید نے کسی نہ محسوس طریقے سے مسلمانوں میں بھی دخل پالیا اور اُن میں بھی ایک "مہدی آخرالزمان" اور "مسیح موعود" کے ظہور و نزول کا عقیدہ قائم ہوگیا۔ چنانچہ ان کی بابت روایات ضعیفہ کی ایک تعداد کثیر کتابوں میں نظر آتی ہے۔ ہر چند اُن کے ضعف اور وضعیت پر اکثر ائمہ محدثین نے کافی روشنی ڈالی ہے مگر مسلمان ہیں کہ اس عقیدے اور خیال پر مٹے ہوئے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ اس ایک عقیدے سے اسلام کی اہمیت و اکملیت اور نبی کریمؐ کی خاتمیت و افضلیت اور قرآن حکیم کی جامعیت و کفایت پر کیا اثر پڑتا ہے۔

قرآن حکیم جو تبیانا لکل شئی کا صحیح طور پر دعویدار ہے اس قسم کی پیشینگوئیوں سے سراسر خالی ہے۔ جب ایک مبصر قرآن حکیم پر غور کرتا ہے تو وہ حیران رہ جاتا ہے کہ اگر اس عقیدہ کی اہمیت ہے تو ایسی مہتم بالشان شخصیتوں کے آنے اور اسلام میں ایسے عظیم انقلاب کے رونما ہونے کا قرآن میں نہ اشارہ تک کیوں نہیں کیا گیا۔ جب اُس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کیوں اپنا

عبادت خانوں میں تبدیل کئے دے رہے تھے۔ یہ اصول کہ " بدی کا مقابلہ نہ کرو " ایک نئے اصول سے بدل ہو گیا " بشرط ضرورت بدی پہ ضرب کاری لگاؤ "۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے :-

"جزاؤ سیئۃ سیئۃ مثلھا "

قدیم مذہب اور تہذیب دنیا کو آسائش اور خوشی بخشنے میں ناکام رہ چکے تھے کیونکہ اُنھوں نے اپنے پیروؤں کو مابعد الطبیعیات کے دائرہ میں مقید کر رکھا تھا اور دنیا کے ٹھوس حالات و واقعات سے دوچار ہونے کا موقع نہیں بخشتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ نہ تو انھیں " نروان " پر یقین تھا اور نہ "جیون کمتی" کی خوشی حاصل تھی۔ نبی کریم نے اس نقصان کو جو اس قسم کا فلسفہ عالم انسانیت کو پہنچا رہا تھا محسوس کیا۔ اس لئے انھوں نے اپنے پیروؤں کو تلقین کی کہ یہ کاروباری اور عملی دنیا سوائے اصل ذات حقیقی کے پرتو کے اور کچھ نہیں ہے یا ایک بڑے فلسفی کے الفاظ ہیں۔ "دنیا دراصل اشیاء کے مادی مظاہرات کے ساتھ ہمارے تصور کا اتصال ہے جو ہمیں ان کے غیر مادی مظاہرات کو تخیل کے واسطہ سے دیکھنے کے لئے تیار کرتا ہے۔ اسی نقطۂ نظر نے انسان میں حسن کی بنیاد ڈالی۔ جس نے بڑھ کر فوادی یعنی دلی حسیات کی بنا ڈالی۔

جب قرآن کریم کہتا ہے کہ قدرت خدا کا مظہر ہے تو وہ گویا ہمیں حکم دیتا ہے کہ قدرت کا مطالعہ کر کے ہم اپنی اور خدا کی ذات میں ایک رشتہ پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ گویا خودی اور غیر خودی میں ایک صورت ربط ہے۔ خدا کی ذات کو سمجھنے کے لئے نبی کریم نے ہمیں مادی دنیا کے متعلق عملی نقطۂ نظر اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے۔ اسی لئے انھوں نے نماز کے اوقات و طریق

کہ ہم ایک مرکز پر مجتمع ہو کر متحدہ زندگی سے کامل تمتع حاصل کریں۔ ہماری اجتماعی عبادت کی غرض بھی یہی تھی کہ ہمارے دلوں میں اجتماعیت کی رُوح کارفرما رہے۔ ہماری اس حقیقت فراموشی کا یہ المناک نتیجہ ہے کہ نہ ایک قسم کے مصائب ہم میں کوئی احساس وبیداری پیدا کرتے ہیں اور نہ ایک قسم کی ناکامیابیاں ہمارے دلوں میں ہمہ گیر اضطراب کی لہریں دوڑاتی ہیں اور نہ مقاصد حیات کی وحدت ہمیں "المسلم والمسلمۃ اُخ واخت" کی یاد دلاتی ہے۔ ہماری موجودہ حالت "مسلماناں در گورِ مسلمانی در کتاب" کی آئینہ دار ہے۔

دنیا روشنی وترقی کے میدان میں اتنی آگے بڑھتی جارہی ہے کہ انسانی توہمات خود بخود ختم ہوتے چلے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ لوگ ان مذاہب کی طرف سے بھی ڈانوا ڈول ہو رہے ہیں، جو فطرت کی کسوٹی پر کھرے نہیں اُترتے۔

ہمارا عقیدہ اور بیشتر غیر مسلم محققین عالم کا اعتراف ہے کہ اسلام دین فطرت ہے اور اس کے تمام اصول، اصول فطرت کے مطابق ہیں اس لئے ہمارا اولین فرض ہے کہ ہم اسلام کے صحیح اصول کی تفتیش وتحقیق کی طرف مائل ہوں اور تعصبات وآمیزشوں کے خس وخاشاک کو دُور کر کے حقیقت وصداقت کے سدابہار پھولوں سے اپنا دامن مراد بھرلیں اور اس طرح ہم اسلام کے صحیح وکامل نمونے بن جائیں کہ تمام اقوام عالم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ

"بیشک اسلام ایک دین فطرت اور عالمگیر مذہب ہے"

ہمیں یہ زریں موقعہ کبھی نہ بھولنا چاہیئے کہ

"ہر درخت اپنے پھلوں سے پہچانا جاتا ہے"

درخت اسلام کی پاکیزگی وخوش ثمری، دُنیا پر ثابت کرنے کے لئے ہمیں تعلیم اسلام کا صحیح اور خوش نما وخوش ذائقہ ثمر بننے کی ضرورت ہے۔ اس مجموعہ مضامین میں بعض اہم مباحث پر اسی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو یا نے اطمینان مسلمان اور اہل علم اگر بنظر غائر مطالعہ فرمائیں گے تو مجھے امید ہے کہ فائدہ سے خالی نہ پائیں گے۔ والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ

درمیان چند لمحوں کے لئے روحانی تفریح حاصل کرسکے۔ قرآن کریم کے الفاظ "امر" و "خلق" اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ خداوند تعالےٰ کی تخلیقی قوت کس طرح اپنا اظہار کرتی ہے اور خالق و خلق کس طرح ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ ہم میں سے وہ لوگ جو ان عظیم الشان ہستیوں کے حالات پر غور کرتے ہیں جنھوں نے دنیا کے حالات کا رُخ بدل دیا۔ اور جو اُن تاریخی واقعات کا مطالعہ کرچکے ہیں جن سے ان ہستیوں کی سیرت کی تشکیل ہوئی دیکھیں کہ روحانی اور مادی دونوں دنیاؤں میں کس طرح یہ اصول کارفرما ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ خارجی اثرات انسان کی ذات پر مرتب ہوئے اور خود اس کی ذات کے اثرات ذات مطلق میں جذب ہوگئے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ روح اور جسم دونوں ایک دوسرے سے متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ اسلام میں قسمت اور تقدیر کے مسئلہ پر امر کے اصول کا بہت حد تک ثبوت ہے۔ یہی اسلام کے مشہور فلسفیوں اور مفکروں نے کہا ہے۔ اس سے انسان ذات خدا کی ایک جھلک دیکھ لیتا ہے اور دنیا کی تمام کشمکشوں سے مقابلہ کرنے کی جرأت پیدا کرتا ہے۔

پھر اسلام میں سب سے بڑا اصول توحید کا ہے جس کی بنا پر سوائے ایک خدا کے کسی کی اطاعت نہیں اور ساری خلقت اس ایک خدا سے وابستہ کردی گئی ہے تاکہ عالم انسانیت سے یگانگت پیدا ہوجائے۔ یہ اصول عالم انسانیت کے اتحاد کا پیغام ہے۔ کیونکہ اس سے ان مصنوعی بندشوں کی روک تھام ہوسکتی ہے جو عالمگیر اخوت کی راہ میں مانع آتی ہیں۔ چونکہ خدا تمام علوم کا سرچشمہ اور زندگی کی روحانی بنیاد ہے۔ اس لئے اس پر ایمان رکھنا انسانیت پر ایمان رکھنا ہے۔ دنیا اور انسانیت کا تصور خدا کی وحدت کے تصور سے وابستہ ہے۔ اسی لئے اسلام

مقرر فرمائے تاکہ ہم اس ذات سے روحانی قرب حاصل کر سکیں۔

دنیا اور اس کے مقصد سے متعلق قرآنی نقطۂ نظر سے ہٹ کر جب ہم افراد کے متعلق غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے تین باتیں پیش کی ہیں:۔

(۱) انسان خدا کا محبوب ہے۔

(۲) انسان اپنی کمزوریوں اور خامیوں کے باوجود زمین پر خدا کا نائب ہے۔

(۳) انسان آزاد ہے۔

ان ہر سہ امور کی روشنی میں کوئی شخص اسلام پر معترض نہیں ہو سکتا کہ اس نے اپنے پیروؤں کو بے عمل ہونے یا قسمت پر شاکر رہنے کی تعلیم دی ہے۔ اس کے برعکس اسلام اپنے پیروؤں کو آزادی کی وہ اخلاقی جرأت بخشتا ہے جو کشاکش حیات کے مقابلہ کے لئے ضروری ہے اور ان لوگوں کی کامیابی کی ضامن ہے جو زندگی کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرتے اور ذاتی جدّوجہد پر ایمان رکھتے ہیں۔ اسلام میں قسمت نتیجہ ہے تقدیر و تدبیر کے متحدہ اثرات کا۔ نبی کریم کا واضح ارشاد ہے:۔

"السعی منی والاتمام من اللہ"

قرآن کریم کہتا ہے:۔

"لیس للانسان الا ما سعیٰ"

اسلام نے انسان سے رہنمائی کا کام لینا چاہا ہے۔ انسان کو اپنے تجربوں کی بنا پر مہذب اور روشن خیال ہونے کی صلاحیت بخشی گئی ہے۔ اسلام میں نماز کے اوقات مقرر کئے گئے ہیں کہ انسان دنیا کی مشغولیتوں کے

اسلام اور اتحاد!

میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کا عقیدہ یہ ہے کہ ہندوستان کی فلاح آپس کے اتحاد پر مبنی ہے۔ میرے نزدیک اگر ہندوستان کی تمام قومیں اتحاد کے لفظ کو رٹنے لگیں تو ہماری آدھی مصیبتیں ختم ہو جائیں خواہ ہم اپنی سب سی جد و جہد چھوڑ بھی دیں۔ یہی نہیں بلکہ میرا خیال ہے کہ ہم کتنی ہی سیاسی جد و جہد کرتے رہیں ہماری فلاح اس وقت تک نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ ہندوستان کی قوموں میں اکثریت اپنی ذمہ واریوں کو نہ سمجھے اور اقلیت رواداری کی اہمیت پر نظر نہ کرے اور جب تک یہ احساس دونوں میں نہ ہوگا کہ ہمیں اگر رہنا ہے تو شیر و شکر ہو کر رہنا ہے اس وقت تک ہمارے ملک کا شیرازہ متحد قوموں میں سے ہونا غیر ممکنات میں سے ہے۔ جس شخص کی یہ رائے ہو اس کا خیال اپنی قوم کے اتحاد کے متعلق کیا ہوگا اس کا اندازہ کرنا آپ کو مشکل نہ ہوگا۔

انسان کی خلقت صرف ایک امتیازی حیثیت کی وجہ سے تمام دنیا کی مخلوق سے مختلف ہوگئی ہے۔ انسان کے جسم کی ساخت بالکل وہی ہے جو طرح طرح کے حیوانوں کی ہے۔ زبان اور سر بھی اُسے ویسے ہی دیئے گئے ہیں جیسے اور حیوانوں کو دیئے گئے ہیں۔ مگر اس کی زبان میں نطق کی قدرت اور اس کے سر میں ادراک و تمیز اس طرح کی گئی ہے کہ اس سے وہ بالکل

میں زندگی کا مقصد خدمتِ خلق ہے، خدمتِ خلق ہی کی وجہ سے مادی دنیا کی فتوحات اور اس کی تحقیق و عرفان کی تعلیم دی گئی ہے۔ خلق کے اس دائرہ کو کسی طرح محدود و مقید کرنا اسلام کی اصل روح سے کوسوں دور ہے جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں انھیں نبی کریم کا یہ ارشاد کبھی نہ بھولنا چاہیئے:

"الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ"

ایک اور حدیث ہے:

مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ اللہ کے نزدیک محبوب ترین ہستی وہ ہے جو عیال اللہ کے ساتھ حسن سلوک کرے۔

نبی کریم ہمیشہ انسانیت کو رنگ، خون یا نسل کے امتیازات کے تحت تقسیم کرنے کے خلاف تھے۔ یہی نہیں بلکہ اپنی فوجوں تک کو آپ کا ایک حکم یہ بھی ہوتا تھا کہ "خبردار دوسروں کے مذہب کی تذلیل نہ کرنا یا کسی کافر کے ساتھ سختی کا برتاؤ نہ کرنا۔" آپ کے نزدیک ساری دنیا ایک بہت بڑی مسجد تھی۔ دراصل اسلامی فلسفۂ زندگی کا بنیاد نبی کریم کی اس حدیث میں موجود ہے۔ حشر کے دن خدا کہے گا "انسان! میں غریب تھا، تو نے میری مدد نہیں کی، میں کمزور رہتا تو نے میری حفاظت نہیں کی، میں بیمار تھا تو نے میری تیمارداری نہیں کی۔" انسان کہے گا "اے خدا! تو کیسے غریب، کمزور اور بیمار ہو سکتا تھا اور میں کیسے تیری مدد کر سکتا تھا۔" اس وقت خداوند کریم ارشاد فرمائے گا "کیا تیرا فلاں عزیز یا بھائی جو میری تخلیق کا مجسمہ تھا حاجتمند نہیں تھا۔ جس کی مدد کرنے سے تو نے انکار کیا؟ اگر تو نے اس کی مدد کی ہوتی تو میں تجھے اس میں مل جاتا۔" الفاظ میں "تجھے اس میں مل جاتا" اسلام میں زندگی کی عظمت و اہمیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔

تو خلاق عالم کا سارا مقصد فوت ہو جاتا ہے اور وہ چیز سامنے آجاتی ہے جس کا شبہ پہلی مخلوق نے اس طرح کیا تھا:۔

اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَ یَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۔ (اے خدا کیا تو زمین میں ایسی مخلوق بنانا چاہتا ہے جو اس میں فساد پھیلائے اور خونریزی کرے۔

یہ اتنا بڑا اور اتنا اہم اصول ہے کہ صرف اسی کو پذیرا کرانے کے لئے انبیاء کی خلقت ہوئی۔ تاریخ بنی آدم کی ممتاز ترین امت یعنی بنی اسرائیل کی توجہ بار بار اس طرف منعطف کرائی گئی اور بار بار اسی محبت و مواخات کا اُن سے عہد لیا گیا چنانچہ قرآن مجید میں ہے:۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۔

اور جب تم سے یہ عہد لیا گیا کہ ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ ایک دوسرے کو گھروں سے نکالنا تم نے اس کا اقرار کیا اور تم اس کے شاہد تھے۔

یہی نہیں بلکہ جن لوگوں نے بڑے بڑے تفرقے پچھلے زمانے میں پیدا کئے ان کے خلاف نبی بھیجے گئے تاکہ وہ ان تفرقوں کو مٹائیں اور سرکشی کو دُنیا سے دُور کریں۔ چنانچہ فرعون کے حالات میں آتا ہے:۔

اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِی الْاَرْضِ وَ جَعَلَ اَهْلَهَا شِیَعًا ۔

خدا کی زمین پر فرعون نے سرکشی کا طوفان اٹھا رکھا تھا اور ساکنان ارض کو گروہ در گروہ کر دیا تھا۔

یہ سلسلہ بڑھتا گیا یہاں تک کہ غیرت حق کا تقاضا ہوا کہ اس سلسلے کو روکے تب ہمارے نبیؐ مبعوث ہوئے اور انہوں نے دنیا کو توحید کی طرف بلایا۔ توحید اور اتحاد دونوں کا مادہ ایک ہے اور دونوں کا مطلب بھی ایک ہے۔

قرآن مجید ہر جگہ ہماری تفریق کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس سے ہم کو روکتا ہے ارشاد ہوتا ہے:۔

ایک نئی چیز ہو گیا ہے۔ وہ تمام دنیا کو دیکھتا ہے، اس پر غور کرتا ہے اور اس نظام عالم کی تعمیر میں خدا کی قدرت کا مظہر ہو جاتا ہے۔ یہ کیوں؟ یہ نطق اور ادراک کی قوت انسان کو دیئے جانے کی خاص وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ان سب سے مل کر کام لیا جائے۔ نطق اس لئے دیا گیا ہے کہ ہر ایک انسان دوسرے کو اچھی طرح سمجھ سکے اور اس کے ساتھ ہمدردی کر سکے۔ دنیا کے کسی حصے کو دیکھو تو یہ معلوم ہوگا کہ انسانی ارتقاء اسی ہمدردی اور میل جول کے اصول پر چلا ہے۔ خود ہندوستان میں انسانی آبادی کا آغاز اس طور سے ہوا کہ چند ہم خیال آدمیوں نے آپس میں مل کر رہنا شروع کیا اور اپنی ضروریات کے مطابق اپنی قوت تمیز کے اعتبار سے ایک نظام قائم کر لیا۔ یہی نظام اور یہی اجتماع خلقت کے ازدیاد کے ساتھ ساتھ انسانی ارتقاء کی مدد سے نظام عالم کو ترقی دیتا گیا۔ اور ہر ترقی کی بنا اسی اتحاد کے اصول پر رکھی گئی۔ اور اسی اتحادی سیمنٹ سے اس کو تقویت دی گئی۔ انسان کا فرض اس دنیا میں جہاں تک دیکھا جاتا ہے صرف یہ ہے کہ آپس میں ہمدردی، محبت اور اخوت کے اصول پر چلے۔ اور عقل و تمیز کو پورے طور پر صرف کر کے نظام عالم کی وسعت اور حقیقت کو سمجھ سکے، اور اس کی ترقی میں کاوش کرے۔ جتنا ہی وہ اس میں کاوش کرے گا اور جتنا ہی حقیقت انسانی کو سمجھے گا، وہ خدا کی خدائی کا راز داں بنیگا اور اپنی ہستی سے خدائی نظام کی بقا کو لوگوں کے دلوں میں بٹھائیگا۔ ہم اس دنیا میں اس لئے نہیں آئے کہ گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر اور خلقت سے علیحدہ ہو کر زندگی بسر کریں۔ اگر یہ مقصود ہوتا تو اتنے بڑے نظام کی ضرورت تھی اور نہ لامتناہی علوم و فنون درکار تھے۔ کسی نے سچ کہا ہے:۔

دردِ دل کیواسطے پیدا کیا انسان کو،
ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

غرض جس پہلو سے دیکھئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نظام عالم میں اتحاد اور انسان اس طرح ایک شیرازے میں منسلک کئے گئے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک کو دوسرے سے علیحدہ کر دو،

تنہا ادا ہو ہی نہیں سکتی یعنی نماز جمعہ جس کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ جب تک نماز ادا نہ ہو جائے جملہ کاروبار پس پشت ڈال دینا مناسب سمجھا گیا ہے۔ اسی طرح حج کا حکم دیا گیا ہے۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کا آپس میں جنہ دن کے لئے ایک پاک مقصد کیواسطے ایک جگہ جمع ہونا اور ہر طبقے کے مسلمانوں کا ایک ہی لباس میں اور یکساں احکام کے ماتحت ہونا ایسا اعلیٰ خیال ہے جس کی اسلام ہی جیسے مقدس اور عالمگیر مذہب میں تلقین کی گئی ہے۔ یہ اس بات کی بڑی دلیل ہے کہ اسلام اتحاد کو بہت ہی اہم سمجھتا ہے۔

اسی طرح اسلام میں ہمارے نبی کو رحمۃ للعالمین کہا گیا ہے اگر لفظ رحمت ہی کو دیکھا جائے تو اس سے معلوم ہوگا کہ اتحاد کی اسلام میں کیا اہمیت ہے۔ کیونکہ لفظ رحمت اور اتحاد میں خود بہت زیادہ رشتۂ موانست ہے۔ پھر اگر آپ اسلام کی تعلیمات پر جزواً جزواً نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ہر چیز میں اتحاد کا پہلو رکھا گیا ہے۔ جمعہ، عیدین، حج، نماز جماعت، یہ سب اتحاد کی اہمیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ زکوٰۃ کے ساتھ بیت المال کا اصول بھی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کرتا ہے تاکہ ہر شخص کو بیت المال سے اُنس ہو، اور ہر شخص کو جو بیت المال کا شریک ہے ایک دوسرے کے ساتھ موانست پیدا ہو جائے۔

یہ پیغام صرف الفاظ تک محدود نہ تھا بلکہ صدر اول کے اُن سراپا عمل مسلمانوں نے اس حقیقت کو ایسا عملی جامہ پہنایا کہ آج تک دنیا کی تاریخ اُس کی مثال پیش نہیں کر سکی۔ اسلام کا رشتہ جس نے انھیں بھائی بھائی بنایا اتنا مضبوط قایم ہوا کہ یہ ممکن تھا کہ ایک باپ اپنے بیٹے کو عاق کر دے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ایک بھائی اپنے خون کے رشتے کے بھائی کو چھوڑ دے، اس کی مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں کہ ایک ماں نے اپنے بچے کو گود سے جدا کر دیا ہو، غرضیکہ تمام دنیا کے رشتوں کا ٹوٹنا اور تمام خونی تعلقات کا قطع ہو جانا ممکن تھا۔ لیکن یہ ممکن نہ تھا کہ جن دلوں کو اللہ نے جوڑ دیا ہے۔ انھیں کوئی توڑ دے اور جو رشتے اللہ نے قایم کر دیے ہیں انہیں کوئی اور قطع کر سکے۔ اور جو برادری قرآن

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا — اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور بکھرو نہیں

خود قرآن مجید کے نازل ہونے کی وجہ اس مقدس کتاب میں یہ بیان کی گئی ہے کہ

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ + — یہ کتاب ہم نے اس لئے نازل کی ہے کہ ان لوگوں کے مختلف فیہ امور میں اصل حقیقت کو واضح کردے اور اس طرح سے ماننے والوں کیلئے ہدایت و رحمت کا موجب بنے +

پھر اس کے بعد تنبیہ بھی فرمائی گئی ہے ۔-

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ + — اور دیکھنا کہیں ان لوگوں کی مانند نہ ہو جانا جنہوں نے باہمی تفرق پیدا کر لی اور واضح احکام پہنچنے کے بعد اختلاف کرنے لگے اور ان لوگوں کیلئے بڑا عذاب ہے

تاریخ شاہد ہے کہ جس وقت اسلام عرب میں آیا ملک میں ہر طرف بے امنی پھیلی ہوئی تھی ۔ فرقہ دارانہ جنگ لوگوں کا معمول تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر تلوار اٹھ جانا معمولی سمجھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں سب سے پہلے نبی کریم کی نظر ملک کی اسی کمزوری پر پڑی یا یوں سمجھئے کہ خود قدرت نے نبی کریم کو ایسے زمانے میں پیدا کیا جب کہ بے امنی اور قتل و غارت گری عام شعار تھا۔ تاکہ آپ واقف ہو سکیں کہ انسانیت کو راہ راست پر لانے کیلئے آپ کو سب سے پہلے کیا کرنا چاہیئے اور یہ کہ آپ کی بعثت کا منشاء و مقصد کیا اور کس قدر اہم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اتحاد پر انتہائی زور دیتا ہے اور اس کی تعلیم اور پیغمبر صلعم کی تلقین میں اتحاد باہمی کے تمام اصول پائے جاتے ہیں ۔ معمولی بات ہے کہ خدا کی پرستش اور عبادت کے لئے تنہائی کی ضرورت ہے تاکہ انسان سکون قلب کیساتھ یاد خدا میں مشغول ہو۔ مگر اس کے برخلاف اسلام نے عبادت کا ایسا طریقہ پیش کیا ہے جو اجتماعیت پر زور دیتا ہے اور اتحاد کی افزائش و ترقی میں معین ثابت ہوتا ہے ۔ یعنی اسلام نے نماز باجماعت کی فضیلت مسلم کر دی، اور ایک نماز تو ایسی ہے جو

کے اختلاف کے باوجود اپنے حلقہ بگوشوں کو ایک کر دیتا ہے۔

(Outlines of History)

وی سلم ورلڈ آف ٹوڈے کا مصنف لکھتا ہے :۔

جمعیت الاقوام کے قیام کی طرف جس طریق سے مسلمان اقوام نے پیش قدمی کی ہے اس سے بہتر مثال دوسری اقوام پیش نہیں کر سکتیں۔

مدینے سے ۴ میل باہر قصبہ قبا میں بنی عمر بن عوف کے محلے میں ایک مسجد تھی جس کے محل وقوع پر رسول اکرم نے مکہ سے ہجرت کے چند روز بعد تک نماز پڑھی تھی اور بعد ازاں یہ مقام مسجد میں تبدیل کر دیا گیا تھا محلہ والوں کی ایک شریر مسلم نما جماعت نے اسلام میں نفاق ڈالنے کی غرض سے ایک اور مسجد اس مسجد کے مقابل کھڑی کر دی اور رسول اللہ سے درخواست کی کہ نماز اول کی امامت بطور افتتاح آپ فرمائیں لیکن اللہ تعالیٰ ان نیتوں سے واقف تھا اس نے نماز کی بنیاد میں مومنوں کے لئے تالیف قلوب اور حقیقی اتحاد اور اہم حکمت عملی رکھی تھی اس لئے ارشاد ہوا کہ جس مسجد کی بنا پراگندگی امت اور تفریق جماعت ہے اور جو امت کو انتشار کے جہنمی گڑھے کی طرف لے جائے اس میں رسول اللہ کا ایک لمحے کے لئے کھڑا ہونا بھی درست نہیں۔

ایک اور واقعہ لیجئے۔ غزوۂ بنی المصطلق میں ایک غفاری اور عونی میں جھگڑا ہو گیا۔ غفاری نے عونی کے تھپڑ مارا۔ غفاری نے مہاجرین کو آواز دی کہ وہ اُنکے حلیف تھے۔ اور عونی نے انصار کو، حضور نے جب یہ سُنا تو سخت برافروختہ ہوئے اور فرمایا کہ یہ کیا جہالت ہے۔

لا ترجعوا بعدی کفارًا ان تضرب بعضکم رقاب بعض۔	دیکھنا میرے بعد کہیں کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔

ورسول کی وساطت سے وجود میں آئی ہے دنیا کی کوئی طاقت اُسے معدوم کر دے جنگ بدر اور احد میں یہ دیکھنے میں آیا کہ حضرت ابو بکر نے اپنے بیٹے عبدالرحمن پر تلوار اٹھائی۔ حضرت حذیفہ نے اپنے باپ حذیفہ کو قتل کر دینا چاہا۔ حضرت عمر نے اپنے ماموں کے خون سے ہاتھ رنگ لئے۔ خود رسول اللہ کے چچا عباس، چچازاد بھائی عقیل اور داماد ابو العاص بدر میں گرفتار ہو کر عام قیدیوں کی طرح رکھے گئے۔ لیکن یہ کہیں ایک دفعہ بھی دیکھنے یا سننے میں نہ آیا کہ کسی مسلمان نے دوسرے مسلمان کو گالی بھی دی ہو۔ اس جذبہ محبت کے بجوبت آفریں نظارے مسلمانوں کی رزم و بزم میں ہر مقام پر دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی معاشرت تھی تو اس رنگ کو لئے ہوئے، ان کی عبادات تھیں تو اسی کی مظہر، ان کے جیوس و مساکر تھے تو اسی حقیقت کے پردہ کشا۔ ان مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ غزوۂ تبوک میں ایک جگہ کچھ جاں بلب مجروح پڑے تھے۔ پانی پلانے والا مجاہد چھوٹا سا مشکیزہ لے آیا جس میں تھوڑا سا پانی تھا ایک طرف سے آواز آئی العطش (نزع کے وقت بالعموم اور ایسی حالت میں جبکہ بدن سے خون نکل چکا ہو۔ بالخصوص پیاس کی شدت تمام احساسات کو مٹا دیتی ہے) سقہ نے پانی اس کے منہ میں ڈالنا ہی چاہا تھا کہ دوسری طرف سے آواز آئی العطش اس مرد مومن نے منہ بند کر لیا اور فرمایا کہ میرے اس بھائی کی آواز زیادہ دردناک ہے۔ معلوم ہوتا ہے اُسے زیادہ تکلیف ہے۔ اُس کی طرف پہلے جاؤ، مشکیزہ بردار وہاں پہنچا تو تیسری طرف سے یہی آواز آئی اور اس مرد مومن نے بھی وہی کچھ کہہ کر پانی والے کو واپس پھیر دیا۔ یہانتک کہ ایک ایک کر کے تمام مجروحوں نے پانی مانگا لیکن دوسرے کی آواز سن کر مشکیزہ بردار کو اس کی طرف بھیجدیا اور اسیطرح تمام کے تمام شہداء نہر سلسبیل پر اپنی پیاس بجھانے چلے گئے اور اُس کے مشکیزہ کا پانی جوں کا توں رہ گیا۔ یہی وہ مواخات تھی جسے دیکھ کر یوروپ کے بڑے بڑے مدبرین انگشت بدنداں رہجاتے ہیں رینان کا قول ہے:

"اسلام ایک ولولہ انگیز قوت ہے جو زبان، وطنیت، طبیعت اور مزاج"

ہوئے بھی مغلوں کے استحکام کی ہندوستان میں توقع کی جا سکتی تھی؟ اتفاق و انتشار کے جن مظاہروں نے ہندوستان کی ہزار سالہ اسلامی سلطنت کا چراغ گل کر دیا۔ ان پر اخوت اسلامی کی روح ہمیشہ رویا کریگی۔ اب ذرا ہماری تاریخ کا ایک اور عبرتناک نظارہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

تقریباً سب مسلمان جانتے ہیں کہ خلافت کا دور بہت آگے نہیں گیا تھا کہ آپس میں اختلافات شروع ہو گئے اور حضرت عثمان اور حضرت علی کے وقت میں جو پارٹی بندی ہوئی اور اس سے جو تفرقے اسلام میں پیدا ہوئے اس کے عبرتناک نتائج آج بھی ہمارے سامنے ہیں۔ ہم نے اسپین فتح کرنے کے بعد وہاں ایسے ایسے کام کئے کہ اسپین ہمیشہ ہمیشہ ہمارا ممنونِ احسان رہتا۔ وہ وحشی تھا ہم نے اُسے متمدن قوم بنایا۔ وہ جہالت کا منبع تھا ہم نے وہاں علم کا چراغ اس طرح روشن کیا کہ دنیا کی مختلف سمتوں میں علم پھیل گیا قرطبہ کے کھنڈر آج بھی ہمارے کارناموں کے شاہد ہیں۔

لیکن آج ہمارا اسپین میں کہیں وجود نہیں ہے۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ ہم میں ایسا تشتت و افتراق پیدا ہو گیا جس نے ہماری جڑ کو وہاں سے کھود پھینکا ہمارے افتراق کی حالت آخر میں وہاں یہ ہو گئی تھی کہ بارہ بارہ میل پر ایک ایک خلیفہ علیحدہ علیحدہ بن بیٹھا تھا۔ ایران کی سلطنت کی کمزوری کا باعث بھی ہمارا انتشار ہی ہوا۔ وہابیوں کی تاریخ میں ایران کی کمزوری کا اصلی پتہ آسانی سے مل سکتا ہے۔ سلطنت عباسیہ کو وزرائے برامکہ کی وجہ سے جو دھکا لگا اور اس کا جو اثر ہوا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

یہ سارے واقعات ہماری نظروں کے سامنے ہیں مگر پھر بھی ہم نے اُن سے ابھی تک کوئی سبق نہیں حاصل کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم ابھی تک یہی نہیں سمجھے ہیں کہ اسلام کس لئے دنیا میں آیا! اس نے ہمیں کیا تعلیم دی۔ اور ہماری زندگی کیا ہونی چاہیئے۔ آج ہماری حالت کیا ہے۔ ہماری زندگی کے جس رُخ کو دیکھو اُس پر افتراق و انتشار کا تسلط ہے۔ آئے دن ہم میں طرح طرح کی نئی جماعتیں

حجۃ الوداع میں عرفات کے خطبے میں عام مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا:-
سُن رکھو، مسلمان مسلمان کا بھائی ہے سب مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔
اب تمہارے خون، تمہاری عزتیں، تمہارے مال، ایک دوسرے پر حرام ہیں
ایک بار شہدائے احد کے مقابر پر تشریف لے گئے تو فرمایا:-

مجھے اس کا خوف نہیں کہ تم میرے بعد شرک کرنے لگو گے مگر ڈرتا ہوں کہ کہیں تم دنیا میں مبتلا نہ ہو جاؤ اور آپس میں لڑنے لگو۔ اگر ایسا کرو گے تو ہلاک ہو جاؤ گے جیسا کہ پہلی امتیں ہو گئیں۔ ان ارشادات مقدسہ نے ہم مسلمانوں کو کیسے کیسا بنا دیا تھا کہ ہر شخص ہمارے اخلاقِ حسنہ سے متاثر ہو کر ہمارا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام ایک سیلاب کی طرح بڑھا اور ایسا بڑھا کہ بڑے سے بڑے روڑے اُس کی ترقی کو نہ روک سکے۔ مگر جب ہماری یہ اتحادی کیفیت زوال پذیر ہوئی تو ہر چیز بدلتی چلی گئی۔

اگر ہماری تاریخ کے اوراق اُلٹے جائیں تو صاف صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ادبار اور ہمارا زوال صرف شیرازۂ ملت کے منتشر کر دینے سے ہوا۔ خلفائے بنو امیہ کی تاریخ پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ میرے دامن میں آج زوالِ ملت اسلامیہ کی داستانیں آسودہ نہ ہوتیں۔ اگر آپس کے اختلاف اس قدر زور نہ پکڑ جاتے۔ بنو عباس کے زوال کی تہ میں یہی چیز کار فرما تھی کہ مسلمان ملت کے مجموعی مفاد کو چھوڑ کر آپس میں دست و گریباں ہونے لگے تھے۔ بہت زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں۔ خود اسلامی ہند کی تاریخ پر ایک نظر ڈال جائیے۔ دودمانِ چراغِ مغلیہ کیوں خاموش ہوا۔ بابر کی حاصل کی ہوئی، اکبر کی مستحکم کی ہوئی اور شاہجہاں کی فروغ دی ہوئی وہ سلطنت جسے عالمگیر نے اسقدر وسیع کر دیا تھا، آخر چشم زدن میں کیوں برباد ہو کر رہ گئی، صرف نفاق سے۔ عالمگیر کی آنکھیں بند ہونے کے بعد جو آپس کی خانہ جنگیاں شروع ہوئیں، کیا اس کے ہوتے

L7160

اسلام اور عالمگیر مساوات

اس مضمون میں یہ بتانا ہے کہ اسلام نے دیگر مذاہب عالم کے ساتھ کس حد تک رواداری اور مساوات کی تعلیم دی ہے۔ نبی کریم اور ان کے چند مقدس جانشینوں نے اس تعلیم کی اپنی زندگی میں کہاں تک پیروی کی۔

انسان کی جسمانی ساخت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ خداوند تعالیٰ نے انسان کو ایک خاص مقصد کے ماتحت پیدا کیا ہے۔ انسان کو دو حاس قوتیں بخشی گئی ہیں جو دوسری کسی مخلوق کو نہیں بخشی گئی ہیں۔ یعنی قوت گویائی اور قوت فکر۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں کا منشاء اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ انسان اس کارخانۂ قدرت یعنی دنیا کو سمجھے اور اس کی ترقی میں ساعی ہو۔ بنی نوع انسان کے دکھ درد کو سمجھے اور اس سے ہمدردی کرے۔ دراصل ایک انسان کا دوسرے انسان سے ایسا گہرا اور قریبی تعلق ہے کہ بغیر ایک دوسرے کی مفاہمت و موافقت کے دنیاوی زندگی کا تخیل ناقص ہی نہیں ناپید ہو جاتا ہے۔ انسان کو دنیا میں ایسے حالات و واقعات سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ وہ تنہائی کی زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ایسا کرے تو کارخانۂ عالم درہم و برہم ہو جائے۔ ذرا دیر کے لئے فرض کیجئے کہ ہم میں سے ہر شخص تنہائی کی زندگی بسر کرتا ہے تو پھر اس وسیع کائنات اور قدرت کے انتظامات و انہماک کی کوئی ضرورت نہیں۔ انسانی تہذیب و تمدن کی یہ مسلسل و

قائم ہوتی ہیں۔ کوئی سوشل، کوئی سیاسی، کوئی معاشرتی اور ان جماعتوں کے قائم کرنے والے لمبے چوڑے الفاظ میں قومی ہمدردیوں کے دعوے دار ہوتے ہیں مگر ان کے دلوں کو دیکھو تو ان میں سانپ اور بچھو بھرے ہوئے ہیں جو دوڑ دوڑ کر اپنے ہی بھائیوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے کاموں کی تہ میں کوئی انفرادی خواہش ہوتی ہے جس کے پورا کرنے کے لئے اس کا بیڑہ اٹھایا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بجائے اتحاد قومی کے ہمارے شیرازے اور بکھر رہے ہیں اور ہماری اجتماعی حالت کو اور بھی نقصان پہنچ رہا ہے۔

کیسے افسوس کی بات ہے کہ جس مذہب نے فرقہ بندیوں کے خلاف ایسا زبردست جہاد کیا ہو آج وہی مذہب فرقہ بندیوں کا سب سے زیادہ شکار ہو۔ مسلمانوں میں بے تمار فرقے پیدا ہو گئے ہیں اور ہر گروہ دوسرے کے درپے آزار ہے۔ قرآن کریم نے ہمیں صرف ایک نام سے مخاطب کیا اور کہا سماکم المسلمین۔ لیکن آج ہمارے بہتر نام ہو گئے سنی، شیعہ، خارجی، حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی مقلد، غیر مقلد، اہل حدیث، وغیرہ وغیرہ کیا اور کتنے کچھ ہمارے نام نہیں ہو گئے۔ اسی طرح اسلام نے تو تمام مسلمانوں کو ذات پات سے بچنے کی تعلیم دی اور کہا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم لیکن ہم نے اپنے کو سید، شیخ، مغل، پٹھان وغیرہ وغیرہ میں تقسیم کر لیا۔ غرض تمام وہ باتیں جو اتحاد کے منافی تھیں ہم نے اختیار کر لیں۔ غور سے دیکھا جائے تو آج کسی نہ کسی شکل میں انفرادیت کا دور دورہ ہے اور اجتماعیت پس پشت ڈال دی گئی ہے۔ اسی لئے ہمارا جو قدم اٹھتا ہے فی الحقیقت نہیں اور پیچھے کی طرف لے جاتا ہے۔ کاش ہم اقبال کی اس تعلیم سے سبق لیں ؎

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

کو فوراً واپس دیدینے کا حکم صادر فرمایا اور کہا کہ ذاتی رنج و مصیبت ایفائے عہد کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے۔ نیز یہ ہوتا آیا ہے کہ جن اقوام کے ساتھ عہد و پیمان ہو اُن سے عدل و انصاف کا برتاؤ کیا جائے مگر اسلام ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور وہاں پہنچتا ہے جہاں ہم اُسے یکہ و تنہا دیکھتے ہیں۔ یعنی اسلام کا حکم ہے (لا یجرمنکم شنآن قوم علی ان لا تعدلوا) (تمھیں کسی قوم کی دشمنی اس بات پر نہ آمادہ کر دے کہ تم ان سے عدل و انصاف کا برتاؤ نہ کرو) یعنی جو قومیں مسلمانوں سے برسرپیکار ہوں جب اُن سے معاملہ پڑے تو رشتہ عدل و انصاف ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ آج اس دورِ تہذیب میں یہ کہا جاتا ہے کہ مقاتلہ و مجادلہ میں سب کچھ روا ہے۔ لیکن اسلام کی تعلیم اس سے بہت بلند ہے وہ کسی حالت میں بھی یہ "سب کچھ" روا نہیں رکھ سکتا، وہ انصاف کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑ سکتا۔

بدترین معاندین کے ساتھ انصاف

مدینہ کے یہود ہمیشہ خارجی قوتوں سے مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے رہے لیکن حضورؐ نے ہمیشہ ان سے معدلت گستری سے کام لیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے معاملات میں اکثر حضورؐ ہی کو اپنا ثالث بناتے تھے۔ کئی مقدمات میں ایک یہودی بحیثیت مدعی کے اور ایک مسلمان بطور مدعا علیہ پیش ہوئے اور حضورؐ نے بہ تقاضائے انصاف مسلمان کے خلاف فیصلہ صادر فرمایا۔ عیسائیوں کا ایک وفد حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کی عبادت کا وقت آیا تو حضورؐ نے انھیں اجازت دی کہ وہ مسجد میں اپنا فریضۂ عبادت ادا کرلیں۔ ایک مرتبہ یہودی توریت کا ایک نسخہ آپ کے پاس لائے۔ آپ نے اُسے تکیہ پر رکھا اور کہا کہ میں اس کی بھی تعظیم کرتا ہوں اور اس کے لانے والے کی بھی۔ جب مکہ فتح ہوا تو تمام سرداران قریش جنھوں نے عمر بھر آپ کی ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا تھا حتیٰ کہ آپ کی جان پر بھی حملہ کیا تھا پابہ جولاں کھڑے تھے۔ دنیا کے کس قانون میں ایسے سرکش دشمنوں کی خطا پوشی کی اجازت دی گئی ہے؟ مگر حضورؐ نے خندہ پیشانی سے انھیں ان الفاظ میں معاف کر دیا:۔

"جاؤ آج کے دن تم پر کوئی مواخذہ نہیں"

تدریجی ترقی جس کا نتیجہ ہماری موجودہ دنیا ہے ، حاصل ہے ، اسی لئے اسلام نے ترک دنیا کی ممانعت کی ہے ۔ قرآن کریم نے عیسائیوں کے متعلق ذکر کرتے ہوئے بھی صاف کہدیا ہے کہ ان کی رہبانیت خود اُن کی آوردہ اور ساختہ پرداختہ ہے احکام خداوندی سے اُسے کوئی تعلق نہیں ۔ ایک شاعر نے خوب کہا ہے ۔

دردِ دل کیواسطے پیدا کیا انسان کو ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

لہٰذا یہ بات واضح ہو گئی کہ انسان ، انسان کے لئے پیدا ہوا ہے اور دنیا میں اس کا فرض ایک دوسرے کے ساتھ بھلائی کرنا ہے ۔ جب یہ معلوم ہو گیا تو کسی مذہب کی سچائی ، عظمت اور فطری ہونے کا معیار یہ ہونا چاہیئے کہ اس نے کہاں تک عالم انسانیت کی بہبود و نفع رسانی و خدمت کی تعلیم دی ہے ۔ اسلام میں جو ایک فطری مذہب ہونے کا دعویٰ کرتا ہے سراسر اس قسم کی تعلیم موجود ہے ۔ قرآن کریم میں بار بار اور اصرار کے ساتھ اس اصول کی تلقین کی گئی ہے اور اس پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ حق العباد یعنی خدمت خلق کو حق اللہ یعنی خدمت خدا پر ترجیح دی گئی ہے ۔ اس اصول کے اظہار میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ کسی مذہب کو دوسرے مذہب پر فوقیت نہ دی جائے ۔ مثال کے طور پر اسلام میں قتل کی ممانعت ہے اور جہاں کہیں قتل کا ذکر آیا ہے وہاں پوری انسانیت مراد ہے ۔ اسی طرح خیانت کی ممانعت کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں یہ ہیں ، اموال الناس یعنی لوگوں کا مال نہ کہ اموال المسلمین یعنی مسلمانوں کا مال ۔ الفاظ کی وسعت ظاہر کرتی ہے کہ خداوند کریم کے نزدیک اس حکم میں سب برابر ہیں ۔

ایفائے عہد کا حیرت انگیز واقعہ

اسی طرح جہاں ایفائے عہد کا حکم ہے وہاں بھی سب برابر ہیں ۔ اس سلسلہ میں نبی کریم کی زندگی کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے ۔ معاہدہ حدیبیہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ مکہ کا کوئی مسلمان مسلمانوں کیطرف آئے تو اہل مکہ کو واپس دے دیا جائے ۔ ابھی معاہدہ کی روشنائی خشک نہ ہوئی تھی کہ مکہ کا ایک بیعیت زدہ مسلمان ، مسلمانوں کی طرف آیا اور اہل مکہ کے ظلم و ستم کی شکایت کرنے لگا مگر نبی کریم نے اُسے اہل مکہ

عالمگیر اخوت کے متعلق ایک ڈاکٹر کا بیان

کچھ دن ہوئے [illegible] نے اپنی ایک تقریر میں یہ تلقین کی تھی کہ ہماری تمام معاشرتی خرابیوں کا علاج عالمگیر اخوت ہے۔ [illegible] اصول کو انھوں نے "No Religion" [illegible] مذہب [illegible] بالکل صحیح ہے [illegible] جبر کا نام انھوں نے "نفی مذہب" [illegible] اصول کی تلقین [illegible] سے تیرہ سو پچاس برس [illegible] انسانیت کی گروہ بندی کے اتنا خلاف ہے کہ قرآن کریم [illegible] جو فرعون پر نبی نازل ہوئے کا باعث ہوئے ایک [illegible] تمام انسانیت میں پھوٹ ڈال رکھی تھی۔

یہاں پر یہ کہا جا سکتا ہے [illegible] جبر کیا [illegible] کی تفصیلات سے گریز کرونگا مگر ابتدا ہی میں [illegible] واضح کر دینا چاہتا ہوں [illegible] مذہب میں جبر کی قطعاً اجازت نہیں دیتا بلکہ وہ سختی سے ہی ممانعت کرتا ہے [illegible] صاف صاف احکام موجود ہیں مثلاً (لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد [illegible] مذہب میں جبر [illegible] نہیں ہے کیونکہ روشنی تاریکی سے از خود متمیز ہو سکتی ہے) ایک اور جگہ ہے لکم دینکم ولی دین [illegible] ہمارا مذہب [illegible] ہمارا مذہب [illegible] ان چند الفاظ میں تو فی الحقیقت قرآن نے [illegible] کی تعلیم کی [illegible] اور مذہبی رواداری اور وسعت قلبی کو اس طرح ظاہر کیا ہے گویا دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے [illegible] ایک [illegible] سے زیادہ صاف الفاظ میں کہا گیا ہے۔

نحن اعلم بما یقولون وما انت علیہم [illegible] جبر سے کوئی بات قبول نہ کراؤ۔ قرآن بجبار فذکر بالقرآن من یخاف وعید [illegible] یقیناً ان کے دل میں گھر کریں گے۔

افواج کی روانگی کے متعلق آپ کے احکام

اسلام کے ان [illegible] پوری پوری پیروی فرماتے تھے۔ چنانچہ اسلامی فوجیں جنگ پر جاتی تھیں تو آپ انھیں ان الفاظ میں ہدایت فرماتے تھے۔ "دیکھو کسی کے مذہب کی تحقیر نہ کرنا اور کسی شخص کی امانت میں خواہ وہ کسی مذہب کا کیوں نہ ہو خیانت نہ کرنا اگر تم نے ایسا کیا تو میں حشر کے دن اس کی طرف سے تم سے مواخذہ کرونگا"

خدمت خلق اور پڑوسیوں کے متعلق چند احادیث

تاریخ اسلام اس قسم کے واقعات اور تعلیمات سے بھری پڑی ہے۔ میں یہاں صرف چند احادیث پیش کرتا ہوں۔

واللہ لا یؤمن واللہ لا یؤمن واللہ لا یؤمن قیل من یا رسول اللہ۔ قال من لا یامن جارہ بوائقہ

خدا کی قسم وہ مسلمان نہیں ہے خدا کی قسم وہ مسلمان نہیں ہے۔ خدا کی قسم وہ مسلمان نہیں ہے۔ لوگوں نے پوچھا کون مسلمان نہیں ہے۔ آپ نے جواب دیا جو اپنے ہمسایہ کو مصائب سے محفوظ نہ رکھے۔

ظاہر ہے کہ لفظ ہمسایہ میں تمام انسانیت کے مفہوم کی وسعت موجود ہے۔ ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:۔

لیس المؤمن الذی یشبع وجارہ جائع الی جنبہ

وہ مسلمان نہیں ہے جس کا ہمسایہ بھوکا رہے اور وہ خود پیٹ بھر کر کھالے۔

یہاں بھی وہی وسعت موجود ہے ایک اور اہم حدیث میں تو صاف صاف کہدیا ہے:۔

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ

تمام خلق خدا کی اولاد ہے اور خدا کے نزدیک سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اس کی اولاد[1] کے ساتھ بھلائی کرتا ہے

ایک موقع پر ارشاد فرمایا ہے:۔

قیامک مع اخیک ساعۃ خیر من اعتکاف سنۃ

اپنے بھائی کے ساتھ ایک لمحہ رہنا اور اس کی خدمت کرنا ایک سال کے اعتکاف سے بڑھ کر ہے۔

---

[1] یاد رہے کہ جو تصور یہاں پر عیال کا ہے وہی اسلام میں "آل" کا ہے۔ ایک نبی کیلئے یہ خیال کرنا کہ وہ اپنی اور اپنی اولاد کی بھلائی کا خواہاں ہو اور پیروؤں کو قطعاً نظر انداز کر دے [illegible] اعلیٰ ظرفیت کے خلاف اتہام ہے۔

مکہ معظمہ کا معاہدہ اور مذہبی رواداری

نبی کریمؐ نے اپنی زندگی میں مذہبی رواداری کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ چنانچہ عہد نامہ کو ملاحظہ کیجئے جس کے شرائط کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ کیا اس سے بڑھ کر فیاضانہ رواداری کوئی مذہب یا کوئی ہادی اپنے دشمنوں کے ساتھ روا رکھ سکتا ہے؟

حضرت عمرؓ نے بھی وہی اصول سلمنا سہ بیت المقدس کے وقت پیش نظر رکھا۔ اس معاہدہ کی رو سے غیر مسلموں کو پوری مذہبی آزادی دی گئی۔ یہاں تک کہ خود اُن کی عبادت گاہوں کی حفاظت کا فرض مسلمانوں پر عائد کیا گیا۔ مصر کی فتح کے وقت بھی اسی اصول پر عمل کیا گیا اور تمام جائدادیں اور جاگیریں جو مسلمانوں کے قبضہ میں آگئی تھیں اہل مصر کو واپس کردی گئیں اور انھیں ان کا مالک تسلیم کر لیا گیا۔ یہیں پر ایک اور تاریخی واقعہ قابل ذکر ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حمص کے فتح ہونے کے چھ ماہ بعد جب مسلمانوں کو بعض انتظامی مصلحتوں کی وجہ سے اپنی فوج وہاں سے ہٹانی پڑی تو وہاں کے عیسائیوں اور یہودیوں کو شبہ ہوا کہ شاید مسلمان ان کا ملک چھوڑ رہے ہیں۔ انھوں نے رو رو کر اُن سے التجا کی کہ خدا کے واسطے ہمیں پھر رومن ظالموں کے پنجوں میں نہ پھنسائو۔ اتنی ہی قلیل مدت میں مسلمانوں کے طرز حکومت و اخلاق نے حمص کے باشندوں پر جو اچھا اثر ڈالا تھا اور جس نے انھیں مجبور کیا کہ وہ مسلمانوں سے رو رو کر شہر نہ چھوڑنے کی التجا کریں۔ مسلمانوں کی حکومت کے فطری اصول کا ایک ادنیٰ مظاہرہ تھا۔ فی الحقیقت شبلی کا یہ شعر ہمارے اس دور حکومت پر پورا پورا صادق آتا ہے ؎

کبھی ہم نے بھی کی تھی حکمرانی ان ممالک پر
مگر وہ حکمرانی جس کا سکہ جان و دل پر تھا

اسلام اور مساوات و جمہوریت کے اصول

حقیقت یہ ہے کہ اسلام ہی نے مساوات اور جمہوری اصولوں کی ابتداء کی اور اس

حضورؐ کے بعض جانشینوں نے بھی ایسا ہی کیا۔ یہ واقعہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ حضرت عمرؓ کا محبوب ترین نوکر ایک عیسائی تھا جو عمر بھر ان کی وفاداری اور نمک حلالی کا دم بھرتا رہا اور حضرت عمر کی تیز تلوار اُسے مسلمان بنانے کے لئے نہیں اُٹھی۔ دور کیوں جائیے دہلی مسلمانوں کا دارالسلطنت سات سو برس کے قریب رہا۔ لیکن آج تک دہلی اور اس کی مضافات میں ہندوؤں کی آبادی مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ اگر مسلمانوں نے تبدیل مذہب کے لئے کسی قسم کا تشدد کیا ہوتا تو آج دوسرا ہی سماں نظر آتا۔ حلقہ اسلام میں داخل ہونیوالوں کی تاریخ ذرا اور پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ جوق جوق اور گروہ کے گروہ از خود اس مذہب میں داخل ہوئے ہیں اور کون لوگ جو ہر قسم کی سختی اور تشدد کیخلاف اپنی جان اور مال قربان کر دیتے۔ بھلا ایسے لوگ کبھی جبر سے حلقۂ اسلام میں آسکتے تھے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر پھر اسلامی لڑائیاں کیوں ہوئیں؟ اسلامی تاریخ ہی کا مطالعہ اس سوال کا بھی جواب دیسکتا ہے۔ ان لڑائیوں کا اصل مقصد جبر و استبداد نہ تھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو مذہبی آزادی نصیب ہو تاریخ اسلامی کا مطالعہ ہر منصف مزاج شخص پر یہ امر واضح کر دیگا کہ نبی کریم اور ان کے چند جانشینوں کے زمانے میں جتنی لڑائیاں ہوئیں وہ مدافعانہ تھیں۔ یہ واقعہ ہے کہ نبی کریم اور انکی مختصر جماعت نے کفار کے ہاتھوں سخت سے سخت مصیبتیں اٹھائیں اور اُف نہ کی۔ یہی نہیں آپ کو مجبور ہو کر اپنے عزیز وطن سے ہجرت کرنی پڑی اور ایک غیر مقام پر رہنا پڑا مگر یہاں بھی آپکے ہموطنوں نے آپ کو چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ اور آپ کی مذہبی تلقین میں مانع اور جان کے درپے ہوئے۔ اندریں حالات جنگ میں شرکت ناگزیر ہوگئی جنگ بدر میں حملہ آوروں کی جماعت تعداد میں ایک ہزار تھی مگر مسلمان صرف تین سو بارہ ۳۱۲ تھے جن کے پاس صرف ایک گھوڑا تھا اور چند اونٹ، کچھ تلواریں اور کھجور کی لکڑیاں تھیں برخلاف اس کے حملہ آور ہر طرح کے آلات جنگ سے مسلح تھے۔ اس کے باوجود حق کی فتح ہوئی۔ تقریباً یہی حال بعد کی دیگر جنگوں کا بھی تھا۔ باقاعدہ اور منظم فوجیں مسلمانوں نے اس سے پہلے میدانوں میں نہیں بھیجیں جبکہ ان میں شہنشاہیت شروع ہوگئی اس وقت کیا ہوا یا ان شہنشاہوں نے کیا کیا اس مضمون کا موضوع نہیں۔ ہمارے ہادی نبی کریم تھے اور جو کچھ ان کے وقت میں ہوا یا ان کے مشہور پیروؤں نے کیا وہی ہمارے لئے نمونہ ہو سکتا ہے۔

کیا ہے ؎

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

اسلام اور خدمت خلق

خود لفظ "اسلام" کے معنی سلامتی کے ہیں اور مسلمانوں کے سلام کے الفاظ "السلام علیکم" (سلامتی ہو تم پر) میں بھی ایک دوسرے کی ہمدردی اور بہی خواہی کا مفہوم پوشیدہ ہے۔ جو اسلام کا عین مقصد ہے۔ ان سب سے مافوق امر یہ ہے کہ ہمارے نبی کریم کو رحمۃ اللعالمین کہا گیا ہے۔ یعنی حضورؐ ساری دنیا کے لئے رحمت ہیں نہ کہ کسی خاص مذہب کے لوگوں کے لئے۔ اسے نبیؐ کا نام نہ سمجھئے بلکہ فی الحقیقت ان الفاظ میں اسلام کا اصلی نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کا اپنے خدا کا تصور تمام کائنات کے ایک خالق اور پروردگار کا ہے۔ اور یہ خیال ہمیں تمام عالم انسانی سے یکساں رابطہ اور وابستگی پیدا کرنے میں معین ہوتا ہے کیا ان تمام شہادتوں کی موجودگی میں یہ کہنا قطعی بیجا اور بالکل درست نہیں ہے کہ اسلام کا مقصد خلق اللہ یعنی تمام دنیا کے لوگوں کی خدمت ہے اور تمام دنیا کے لوگوں کی خدمت کا نام اسلام ہے۔ ایک سچا مسلمان کبھی اس تعلیم کو پسِ پشت ڈال کر اپنے جذبۂ خدمت کو صرف مسلمانوں کے لئے محدود و مقید نہیں کر سکتا۔

؎ یعنی اسلام۔

کے نچلے پیروؤں نے اپنے عمل سے ان اصولوں کو عروج و کمال پر پہنچا دیا۔ یہ اصول مسلمانوں کے دلوں میں اس طرح جاگزیں ہو گئے کہ ہمارے مطلق العنان بادشاہ بھی ان اصولوں کو نظر انداز نہ کر سکے ہندوستان میں فرقہ بندیوں اور ذات پات کی جو بندشیں تھیں انہیں دیکھتے ہوئے وہ کیا کچھ نہ کر سکتے تھے لیکن باوجود اس کے کسی مسلمان بادشاہ کے لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے اس قسم کی بندشوں کی حوصلہ افزائی کی۔ قرآن بار بار ہماری توجہ اس نظریے کی طرف مبذول کراتا ہے اس کی صاف تعلیم ہے کہ تمام انسانوں کی اصل ایک ہے اور کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ایک دوسرے پر ترجیح دے۔ قرآن کی مشہور آیت ہے :-

وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ

(قبائل اور طبقات کی تقسیم محض پہچان کے لئے ہے (جیسے ہم لوگ مکانوں پر نمبر ڈالتے ہیں) اس سے کسی قسم کا تفوق نہیں حاصل ہوتا۔ خدا کے نزدیک سب سے بہتر وہی ہے جو خدمتِ خدا اور خدمتِ خلق میں سب سے بہتر ہے۔ یاد رکھئے کہ لفظ اتقا میں صرف اخلاقی و روحانی عظمت کا راز مضمر ہے۔ اس کا نچلا انسان نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس بنا پر بھی کچھ کہنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ نبی کریمؐ نے تو ایک دفعہ یہاں تک فرمایا کہ لا تفضلونی علیٰ ابن بطہ (مجھے یونس ابن بطے بھی نہ بڑھاؤ) حضرت فاطمہؓ کو بھی ایک مرتبہ یہ تلقین کی گئی لا تعتمدی انک بنتی اعملی اعملی (اے فاطمہؓ! اس پر بھروسہ نہ کرنا کہ تم میری بیٹی ہو بلکہ تم عمل کرنا عمل کرنا) غرض اسلام نے ان تمام بندشوں کے ساتھ جہاد کیا ہے جو انسان کی خود ساختہ ہیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اسلام اقتصادی، دماغی، جسمانی امتیازات کے خلاف ہے۔ یہ اختلافات تو فطری اور ناگزیر ہیں۔ جاحظ نے اس خیال کو اپنے رنگ میں یوں ادا

تم اُس سے بے رُخی برتتے ہو جو حسد کو چاہتا ہے اور اس کی طرف متوجہ ہوتے ہو جو خدا کو نہیں چاہتا

پورا واقعہ قرآن کی بات سے معلوم ہوتا ہے

اسلام نہیں تجارت اور دیگر پیشوں کی تلقین کرتا ہے اور محنت کو بھیک پر ترجیح دیتا ہے۔ حدیث میں ہے "جو شخص گدھا یا اپنی پیٹھ پر لاد کر لے جائے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو بھیک مانگے۔ اسلام میں پیشہ ذلیل نہیں سمجھا جاتا چنانچہ تاریخ سے ثابت ہے کہ خود نبی کریمؐ نے یہاں کچھ مہمان آئے اور مسجد نبوی میں پاخانہ پھر گئے۔ صحابہ نے چاہا کہ وہ اُسے صاف کریں مگر آپ نے انھیں صاف نہ کرنے دیا اور خود اپنے ہاتھوں سے صاف کیا۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آپ گھر میں جتنی دیر رہتے کام کاج میں مصروف رہتے، جھاڑو دیتے، خود اپنے کپڑوں میں پیوند لگاتے۔ دودھ دوہتے اور بازار سے سودا خرید لاتے۔ جنگل سے لکڑیاں لاتے۔ تعمیر مسجد قبا اور تعمیر خندق میں عام مزدوروں کے ساتھ خود کام کرتے تھے۔

ایک سفر میں ایک صحابی نے بکری ذبح کی اور اس کے پکانے کے لئے لوگوں نے آپس میں کام تقسیم کر لیا تو خود رسول کریمؐ نے فرمایا کہ "جنگل سے لکڑیاں میں لاؤں گا"۔ صحابہ نے تامل کیا تو فرمایا کہ "میں امتیاز پسند نہیں کرتا" چنانچہ خود جنگل گئے اور وہاں سے لکڑیاں لائے۔ امام حسنؒ نے سچ فرمایا ہے "کان یخدم نفسہ" یعنی نبی کریم اپنا کام خود کیا کرتے تھے۔

مزدوری اور دیگر پیشہ کا قرن اولیٰ میں رواج ہی نہیں تھا بلکہ وہ عزت سے دیکھے جاتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ مزدوری کیے اپنا گزارہ کرتے تھے اور حضرت علیؓ کنویں سے پانی نکال نکال کر اس کی آمدنی پر زندگی بسر کرتے تھے۔ یہاں پر دو واقعے دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔

میں جب انگلستان میں تھا تو جس خاندان میں میں رہتا تھا اس میں میں نے یہ دیکھا کہ جو ان کے پاس نوکرنی تھی وہ تو ہم لوگوں کا بستر صبح کو آکر لگا جاتی تھی۔ اور خود مالکہ مکان رات کے پیشاب کا برتن اور صبح کو منہ دھوئے ہوئے پانی کا طشت لیجا کر صاف کرتی تھی۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ یہ تقسیم کار کیوں کی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے یہاں کوئی کام بُرا نہیں سمجھا جاتا۔ اب اس کے مقابلہ

طبقات اور اسلام

آج دنیا میں طرح طرح کے لوگ مختلف نظریات اور اصول لے کر اُٹھتے ہیں اور اپنا کہکر عالمِ انسانیت کو اپنے طرف مائل کرتے ہیں۔ انھیں اصولوں میں سے ایک اصول طبقات کی تنگ کنی ہے۔ مارکس۔ لینن اور خدا جانے کتنے فلسفی آج ایسے ہی اصولوں کے مدعی ہیں اور لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید یہ اصول بالکل نئے ہیں، غربا، مزدور و کاشتکار کی حمایت کے نام سے ان لوگوں نے جو کچھ دنیا میں کیا مجھے اس وقت اس پر تبصرہ کرنا نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اسلام نے اس عام طبقہ انسانی کے لئے کیا کیا، اور نبی کریم نے اپنی زندگی سے ان کی حمایت کا کیا ثبوت دیا اسلام کا سب سے بڑا اصول اخوت اسلامی اور اخوت انسانی ہے۔ قرآن میں ہے،

واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداءً فالّف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخواناً

(خدا کی اس نعمت کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے سخت دشمن تھے۔ پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت ڈال دی اور اپنی عنایت سے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا)

حدیث میں ہے المسلم اخُ المُسلِمِ۔

ایک اور حدیث ہے الخلق عیال اللہ۔ الخ

محض اسی اصول نے طبقات پر ایک ضرب کاری لگائی۔ اسلام اس معاملے میں اتنا سخت ہے کہ ایک مرتبہ عمائدین قریش آپ کے پاس بیٹھے تھے اور آپ اسلام کی تبلیغ فرما رہے تھے کہ عبداللہ بن اُم مکتوم جو غریب بھی تھے اور اندھے بھی آکر آپ کے پاس بیٹھ گئے، عمائدین قریش کو تو ناگوار ہوا ہی لیکن خود رسول کریم نے کچھ توجہ نہ کی لہٰذا وحی آئی۔ عبس وتولیٰ ان جاءہ الاعمیٰ الخ

تھا آپ پیادہ پا تھے اور اونٹ کی نکیل آپ کے ہاتھ میں تھی۔ دنیا کی تاریخ میں مساوات کی کوئی مثال اس سے بہتر نہیں ملتی۔

اسلامی تاریخ کا یہ واقعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب سلطنت روما کے سپہ سالار اعظم نے مسلمانوں کو دیکھا تو اس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ سب مزدوروں کے طبقہ کے آدمی ہیں۔ اس نے حضرت خالدؓ ابن ولید سے دریافت کیا کہ "کیا تم میں کوئی بڑا آدمی نہیں ہے جو بڑی قسم کا سیاست داں ہو اور صلح و پیام کا کام کر سکے"۔ آپ نے فرمایا کہ "ہم سب ایک ہی وقت میں مزدور اور کاشتکار بھی ہیں، مدبر اور حاکم بھی۔ ہمارے یہاں علیحدہ طبقے نہیں ہیں"۔ وہ رومی سپہ سالار یہ سن کر حیران و ششدر رہ گیا۔

فی الحقیقت یہ اسلام ہی ہے جس میں غلام بادشاہ ہوئے ہیں اور مسلمانوں کے کسی طبقے نے اس لئے ان کی اطاعت سے انکار نہیں کیا کہ وہ خاندان غلامان سے ہیں۔ یہ اسلام ہی ہے جس نے اس زمانہ میں جبکہ غلام کا طبقہ ادنیٰ ترین تھا۔ اس میں اور ملک کے اعلیٰ ترین طبقے میں تعلقات پیدا کرا دئے۔ چنانچہ بلال حبشی کی شادی قبیلہ قریش میں کی گئی اور دوسرے غلام زید کی شادی خود نبی کریم کے خاندان میں حضرت زینبؓ کے ساتھ ہوئی۔ جوش ملیح آبادی کیا خوب کہتے ہیں ؎

ہاں! اسی دن نطق یزداں نے کیا تھا یوں کلام
آج سے منسوخ ہے قانونِ آقا و غلام

میں یہ واقعہ سنئے کہ میں ایک ضلع میں تھا۔ وہاں چند مہتر ایک بار مسجد میں نماز پڑھنے آئے تو مسلمانوں نے ان کو نماز نہ پڑھنے دی اور نکال دیا۔ لیکن وہاں دو سید عالم ایسے تھے جنھوں نے مسلمانوں کو تنبیہہ ہی نہیں کی بلکہ خود ان مہتروں کی دعوت قبول کی اور ان کے یہاں جا کر کھانا کھایا۔ تب یہ قصہ ختم ہوا۔ اسی طرح میں نے ایک بار ایک مہتر اپنے یہاں رکھا تو میرے بعض ساتھیوں نے میرے ساتھ کھانا چھوڑ دیا مگر میرے سامنے جو اصول تھا اس کو دیکھتے ہوئے میں ان چیزوں سے کیسے متاثر ہو سکتا تھا۔ ع "خلقے بہ طعن و گفتگو عاشق بہ کار خویشتن"

ان واقعات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے اسلامی اصول دوسری قوموں نے لے لئے لیکن ہم خارجی اثرات سے متاثر ہو کر انہیں چھوڑ بیٹھے۔

اسلام میں امیر طبقہ قرن اولے میں بھی تھا لیکن امارت کے ظاہری تزک و احتشام سے نبی کریم کو اس قدر نفرت تھی کہ کبھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی۔ اس لئے کہ آپ یہ نہیں چاہتے تھے کہ غربا کے دل چھوٹے ہوں۔ چنانچہ ایک معمولی سا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت علیؓ کی دعوت کی اور کھانا آپ کے گھر بھیجا۔ حضرت فاطمہؓ نے کہا کہ اگر رسول اللہ بھی ہمارے ساتھ کھاتے تو بہت اچھا ہوتا۔ حضرت علیؓ کے کہنے سے آپ تشریف لائے لیکن دروازے پر پہنچے تو دیکھا کہ گھر میں دروازوں پر پردے لٹکے ہوئے ہیں۔ آپ فوراً واپس چلے آئے اور فرمایا کہ یہ پیغمبر کی شان کے خلاف ہے کہ وہ زیب و زینت کے مکان میں داخل ہو۔

آپ کو طبقات کی تفریق کے اٹھانے کا اتنا خیال تھا کہ جب مجمع میں آتے تو اگر کوئی تعظیم کے لئے کھڑا ہونا چاہتا تو فرماتے کہ "عجمیوں کی رسم مت اختیار کرو"۔ مفلسوں، فقیروں کے یہاں جا کر ساتھ بیٹھتے اور کھاتے پیتے تھے۔ صحابہؓ کے ساتھ بیٹھتے تو اس طرح کہ امتیازی حیثیت کی بنا پر کوئی پہچان ہی نہ سکتا تھا۔ اسی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ خلیفہ ثانی جب بیت المقدس میں اس کو فتح کرنے کے لئے پہنچے تو آپ کا غلام اونٹ پر سوار

اپنے زمانہ کے مصائب کا مقابلہ کرنے کی جرأت رکھتے ہیں۔ زیادہ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنے زمانہ کی روش کے متلاطم سمندر میں خس و خاشاک کی طرح بہنے لگتے ہیں۔ صرف وہی لوگ جو بنی نوع انسان کے پیدائشی بیدار ہیں اور اپنی زندگی کے ذریعہ اہلِ دُنیا کو کوئی مستقل پیغام پہنچانا چاہتے ہیں اپنے زمانہ کے مصائب کے خلاف صدا بلند کرتے ہیں۔ اُن کی زندگی کا یہ مقصد اور پیام ہی اصل میں اُن میں وہ جرأت اور دلیری پیدا کرتا ہے جس سے وہ اختلاف کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ مصائب اور آلام کے خلاف اس ضبط و استقلال سے ثابت قدم رہتے ہیں جیسے طوفانی سمندر میں خاکنائے جبرالٹر۔ یہی وہ لوگ ہیں جو کشاکش حیات میں اپنی جان کی بازی لگا دیتے ہیں۔

نبی کریم صلعم کے زمانہ میں خود آپ کی اپنی زندگی کے علاوہ جو صداقت اور ایمان سے معمور تھی کوئی بات ایسی نہ تھی جس سے آپ کی رُوحانی تعلیم کو تقویت پہنچتی۔ نہ فضا ایسی، نہ معاشرت ایسی اور نہ مجالس ہی ایسی۔ تاریخ شاہد ہے کہ مختلف زمانوں میں دُنیا کی عظیم المرتبت ہستیاں بلا جدوجہد کے اس میں کامیاب نہیں ہوئیں کہ اپنی زندگی کو اپنے مقلدین کے لئے ایک کامیاب نمونہ بنائیں۔ مگر نبی کریم صلعم کا حال اس سے جُدا ہے شروع ہی سے آپ کی خانگی زندگی اور آپ کی زندگی بہ حیثیت ایک مُصلح کے یکساں رہی۔ بلکہ میں کہونگا کہ آپ کی روزمرّہ کی زندگی ہی میں آپ کے ایک مُصلح اعظم ہونے کا راز پنہاں ہے اور یہی تصویر کا وہ رُخ ہے جو آپ کو بعض دوسرے مذاہب کے بانیوں سے ممتاز کرتا ہے۔ مثلاً تاریخ کے طالبعلموں سے یہ واقعہ پوشیدہ نہیں ہے کہ مہاتما بُدھ کو اپنی روزمرّہ کی زندگی کو ان اصولوں کے مطابق ڈھالنے کے لئے جن کو وہ دنیا میں رواج دینا چاہتے تھے مستقل جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ برخلاف اس کے نبی کریم صلعم کی زندگی قبل بعثت و بعد بعثت یکساں و متوازن رہی۔

نبی کریم صلعم بہ حیثیت ایک انسان کے

تاریخ شاہد ہے کہ دُنیا کی عظیم المرتبت ہستیوں اور مُصلحوں کی ذات کے ساتھ حکایات وابستہ ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض حکایات کو تاریخی جامہ نہیں پہنایا جا سکتا۔ مگر بعض حکایات ایسی معتبر ثابت ہوتی ہیں کہ کوئی مؤرخ اُن کی طرف سے چشم پوشی نہیں کر سکتا دراصل ایسے ہی مؤخر الذکر قسم کے واقعات اُن کی اندرونی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ نبی کریم صلعم کی زندگی بھی ایسے ہی واقعات سے بھری پڑی ہے۔ آپ ایک اہم تاریخی زمانہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کی روزمرہ کی زندگی کے صحیح واقعات و حالات قلمبند کرنے کی انتہائی کوشش کی گئی ہے اور تقریباً کوئی بات ایسی نہیں رہ گئی کہ جو تحریر میں نہ آئی ہو۔ اس لئے آپ کا ایک انسان کی حیثیت سے اندازہ کرنے کے لئے آپ کی زندگی کے روزمرہ کے واقعات پیش کرنا مشکل نہیں ہے۔ اور میں انھیں واقعات کو پیش کرنے پر اکتفا کرونگا۔

نبی کریم صلعم کی شخصیت کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ابتدا ہی میں آپ کے زمانہ کے سیاسی۔ معاشرتی اور اقتصادی حالات ہماری نظر کے سامنے ہوں۔ اس سے ہمیں آپ کی ذات کے ہمہ گیر اثر و اقتدار کے اصل اسباب کے سمجھنے میں مدد ملیگی۔ ہم جیسے فانی انسانوں کا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ دُنیا میں کم آدمی ایسے ہوتے ہیں جو

سارے ایشیا کی نصف آبادی [illegible] پر اس عظیم الشان ستارہ کی نور نظر آنے لگی۔ آپ کی تعلیم و تبلیغ سے پہلے ہی لوگ آپ کی انسانی صفات کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ لوگوں کے سامنے آپ کی روزمرہ کی زندگی ایک مثالی زندگی تھی۔ سب سے پہلی صفت جس نے لوگوں کو آپ کا گرویدہ کیا یہ تھی کہ بچپن ہی سے آپ نے ایک بار بھی جھوٹ نہ بولا تھا اور کوئی کام ایسا نہ کیا جس سے آپ اپنے عزیزوں یا دوسرے لوگوں کا اعتماد کھو دیتے۔ چنانچہ نبی ہونے سے بہت پہلے ہی آپ امین کے نام سے مشہور ہو چکے تھے یاد رکھنا چاہئے کہ اس زمانے میں بنکوں کا رواج نہ تھا جہاں لوگ اپنا روپیہ یا اپنی املاک امانت کے طور پر جمع کرتے۔ اس لئے لوگ اپنی امانت دوسروں کے پاس رکھنے میں بڑی احتیاط کرتے تھے۔ لیکن آپ کے پاس بلا خوف و خطر لوگ اپنی امانت رکھ جاتے تھے۔ آپ کی زندگی کا یہی پہلو تھا جس سے متاثر ہو کر اس زمانہ میں عرب کی سب سے دولتمند خاتون حضرت خدیجہؓ نے آپ سے نکاح کر لیا۔ آپ کی زندگی کا ایک اور واقعہ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ بہ حیثیت ایک انسان کے دنیاوی طمع اور لالچ سے کس قدر بری تھی اور آپ کی روزمرہ کی زندگی میں صداقت کا معیار کس قدر بلند تھا۔ خود آپ کے قبیلہ قریش کے لوگوں نے آپ کو طرح طرح کے لالچ دئے۔ کیونکہ آپ کی تعلیمات کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں اُن کا وقار کم ہو رہا تھا۔ متعدد بار انہوں نے اپنے نمائندوں کو آپ کے پاس بھیجا اور اپنے قبیلے کی سرداری مکہ کی حکومت عرب کی حسین ترین اور امیر سے امیر لڑکی کے ساتھ شادی اور اسی طرح کے اور بیسیوں لالچ دلائے مگر نبی کریم صلعم نے ان سب سے یکلخت انکار کر دیا اور صاف کہہ دیا کہ آپ دنیا کی بڑی سے بڑی چیز کی خاطر بھی اپنے پیام کی تبلیغ سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اس زمانہ میں یہ عام عقیدہ تھا اور مجھے اندیشہ ہے کہ اب تک ہے کہ خداوند کریم کی طرف سے مبعوث کئے ہوئے نبی سے خرق عادات کا ہونا ضروری ہے اس لئے لوگوں نے آپ سے کہا کہ اگر تم برحق نبی ہو تو معجزات دکھاؤ۔ جس پر نبی کریم صلعم نے فرمایا:

آپ کی یہی عملی زندگی تھی جس نے آپ کے مخالفین کو شکست اور آپ کو کامیابی عطا کی۔ جس وقت آپ نے خداوند کریم کی وحدانیت کا ڈنکا بجایا اُس وقت آپ کے چاروں طرف ہزاروں مصنوعی خدا موجود تھے۔ جب آپ نے لوگوں کو مساوات کی تعلیم دی تو آپ نے دیکھا کہ دنیائے انسانیت ہزاروں قبائل میں منقسم تھی اور ہر قبیلہ اپنے کو دوسرے قبیلے سے افضل سمجھتا تھا۔ اور اپنے نسلی امتیازات اور برتری کے متعلق عجیب و غریب خیالات رکھتا تھا۔ آپ نے یہ بھی دیکھا کہ دوسروں کا مال غصب کر جانا کمال سمجھا جاتا تھا۔ غلامی ایک قدرتی چیز اور سماج اور دولتمندی کے معیار کی تقویب کا باعث سمجھی جاتی تھی۔ عورتوں کے کوئی حقوق نہ تھے۔ بچوں کے قتل کا عام رواج تھا۔ فراقی اُن کی زندگی کا معمول تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں کوئی معیار اخلاق نہ تھا بلکہ سارے ملک میں صحرائی قانون نافذ تھا۔ مختصراً واقعات و حالات کی ابتری اس حد پر پہنچ گئی تھی کہ یا تو عرب کا سماجی اور اخلاقی زوال مکمل ہو جاتا یا خداوند کریم عرب کو زوال سے محفوظ رکھنے اور اس کی از سر نو اصلاح و تعمیر کی غرض سے کوئی راہبر مبعوث کرتا۔ گیتا کا یہ قول مشہور ہے کہ جب کبھی مذہب اور قانون خطرے میں ہوتے ہیں خدا دنیا میں کوئی رہبر بھیجتا ہے۔ چنانچہ خداوند کریم نے انسانیت کے قدرتی مقصد کی تکمیل کے لئے نبی کریم صلعم کو پیدا کیا۔ اگر اسباب سے نتائج اخذ کرنے کا اصول صحیح ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانہ کے تاریخی اسباب و علل کا قدرتی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہمارے پیارے نبی کریم صلعم اس کارزار حیات میں تشریف لائیں۔ اس زمانہ کے معاشرتی اور تاریخی حالات کا صحیح جائزہ لیتے ہوئے ہم پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اُس زمانہ میں نبی کریم صلعم کی پیدائش ایک اتفاقی واقعہ نہ تھی۔

نبی کریم صلعم نے اپنی شخصیت اور پیام کے ذریعہ اُن عظیم تاریخی عقاید و خیالات کی رَو کا رُخ پلٹ دیا جو عرب کی ساری سرزمین میں جاری و ساری تھے۔ اُسی وقت عرب کی ادبی

دشمن ابوسفیان کے بھی [illegible] نبی [illegible] مسلم نے [illegible] اور [illegible] آپ کے [illegible] خوف [illegible] لائے گئے [illegible] سب معاف کر دیے۔

آپ کا [illegible] کے [illegible] معتقدین [illegible] اس پر خود بھی عمل فرماتے۔ اس دفعہ [illegible] واللہ لا اومن من یشبع وجارہ جائع [illegible]

آپ کو اپنے دشمنوں سے بغض نہ تھا مثلاً آپ کا دشمن عبداللہ بن اُبی فوت ہوا تو آپ نے اپنا عمامہ اُس کے کفن کے لئے دے دیا۔ ایک خادم (انس رضی) سے جو آپ کے پاس دس برس تک رہے روایت ہے کہ آپ نے کبھی اس کے لئے کوئی سخت لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس وقت بھی جب آپ عرب کے سب سے بڑے سردار اور اسلام کے آفتاب تھے بعض وحشی ملنے آتے اور آپ ہی کے حجرے میں قیام کرتے وہ چلے جاتے تو آپ خود حجرہ صاف کرتے۔ حالانکہ آپ کے ہزاروں معتقدین اس کام کے لئے دوڑ پڑتے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ انتقال کے وقت آپ نہ صرف ایک بڑے مذہب کے رُوحانی پیشوا تھے بلکہ ایک سلطنت کے مالک تھے۔ اگر آپ چاہتے تو نمود و نمائش اور شوکت و امارت سے رہ سکتے تھے اور بے شمار دولت جمع کر لیتے مگر تاریخ شاہد ہے کہ آپ کے انتقال پر آپ کی زرہ [illegible] کے عوض رہن رکھی پڑی۔ بیت المال کا ایک حبہ بھی آپ نے اپنی ذات پر صرف نہ کیا۔ بلکہ اپنے ذاتی کسب و ریاضت سے ضروریات حیات مہیا کرتے تھے۔

کاش دُنیا کے جدید آپ کی زندگی کے واقعات سے سبق حاصل کرے اور مصائب اور مشکلات سے بھری ہوئی اس دنیا کے [illegible] نظام میں توازن اور مناسب قائم کرے۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ آپ ایک زبردست اہل سیف ایک زبردست مدبر ایک زبردست مصلح تھے مگر ان سب سے بڑھ کر آپ ایک زبردست انسان کامل تھے۔

اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ - میں تو تمہاری طرح ایک معمولی انسان ہوں - اگر تم میں اور مجھ میں کچھ فرق ہے تو صرف اتنا کہ میں تمہارے پاس خدا کا پیغام لایا ہوں - آپ نے یہ بھی فرمایا کہ وہ لوگ آپ کے متعلق معجزات اور خرق عادات کی بجائے آپ کی روزمرہ کی زندگی کا جائزہ سنجیدگی سے قائم کریں۔ آپ نے فرمایا قد لبثت فیکم عمرًا الخ میں تو تم ہی میں رہا ہوں، بتلاؤ کہ میری زندگی ہی سے میرے پیام کی صداقت کے کیوں قائل نہیں ہوتے - اس ضمن میں یہ بیان کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ جس دن آپ کے لڑکے ابراہیم کا انتقال ہوا اسی دن اتفاق سے سورج گرہن واقع ہوا - اس واقعہ سے لوگوں کو یقین ہوا کہ آپ خدا کے نبی ہیں اور انہوں نے سمجھا کہ آپ کے لڑکے کی وفات پر بندگی روح اشیاء بھی متاثر ہیں - یہ دیکھ کر لوگ آپ کے پاس آئے اور آپ کی نبوت پر ایمان لائے - آپ نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ اگر تم لوگ اس واقعہ سے متاثر ہو کر میرے پاس آئے ہو تو یاد رکھو کہ اس واقعہ کا میرے لڑکے کی موت سے کوئی تعلق نہیں - اور ایسی حالت میں تم مسلمان نہیں ہو سکتے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ نبی کریم صلعم کی ذات کتنی اعلےٰ ترذات تھی - نیز سچائی کا کتنا بلند معیار آپ کے پیش نظر تھا - از روئے نفسیات ماننا پڑتا ہے کہ اگر آپ کی زندگی میں کوئی خامی ہوتی تو آپ کو اپنے مذہب کی تلقین میں ایسی بے مثال کامیابی نہ ہوتی -

آپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے واقف ہونے کیلئے بعض اور واقعات پیش کئے جاتے ہیں۔ مدینہ کے یہودی ہمیشہ آپ کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے کیونکہ اسلام کی اقتصادیات سے انکے مالیات پر ضرب کاری لگتی تھی - اس کے باوجود وہ اکثر اپنے مقدمات میں یہاں تک کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی صورت میں بھی آپ ہی کو ثالث قرار دیتے - ایک اور تاریخی واقعہ جس سے آپ کی روزمرہ کی زندگی کی عظمت پر روشنی پڑتی ہے یہ ہے کہ جب عمرو بن عاص نے شاہ نجاشی والیٔ حبش سے کہا کہ جن مہاجرین نے اس کے ملک میں پناہ لی تھی انہیں ملک سے نکالدے تو اس نے نبی کریم صلعم کی زندگی کے حالات دریافت کئے اور آخر میں اس نے بھی اقرار کیا کہ بیشک آپ کی زندگی بیداغ، مکمل اور قابل تقلید ہے - آپ کی زندگی کے متعلق ایسا ہی عمدہ خیال آپ کے ایک دشمن

سوا اور کہیں ان صفات کا تعین نہ ملا اور جہاں اس حقیقت کا احساس ہوا کہ اسلام کے سوا کسی مذہبی یا اخلاقی تعلیم نے اس کا دعوے بھی نہیں کیا کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط واقعہ یہ ہے کہ تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب تھا جس نے کمالات انسانی کے صفات معین کئے اور اس عالم میں بسنے والوں کے لئے عملی زندگی میں حصول کمال کے قابل عمل راستے بنائے۔ اور اس کا اعتراف غیر مسلموں کو بھی ہے۔ چنانچہ مہاتما گاندھی نے فرمایا ہے کہ عملی اصول کے لحاظ سے اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو انسانی فطرت پر پورا اترتا ہے۔ قدیم ہندوستانی تمدن نے حصول کمالات انسانی کا جو نظریہ قائم کیا وہ دنیا کی زندگی میں ناقابل حصول تھا اور اگر کسی سرزمین کے سارے باشندے ترک لذات اور رہبانیت کے وہ طریقے اختیار کرلیں جن کے بغیر اس تمدن کے بموجب کوئی انسان کامل نہیں بن سکتا۔ تو یہ سرزمین چند ہی میں ویران ہو جائے اور شہر و بلاد کی ساری سرگرمیاں ناپید ہو جائیں۔ مغرب کا جدید تمدن بالکل دوسرے پر پہنچ گیا ہے اور اس نے دنیا آباد رکھنے کے تو سارے سامان مہیا کرنے کی کوشش کی مگر اس دنیا سے انسانی کمال کا تخیل گھٹتے گھٹتے اب بالکل کم ہو گیا اور آج یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ انسانیت کا کمال ہے کیا چیز۔ ایک مشہور مصنف آر۔ ایس۔ فورمین اپنی کتاب "گریٹ کرسچینس کے دیباچہ میں لکھتا ہے:

"یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا عظمت و کمال کی کوئی ذہنی بخش تعریف ممکن ہے"۔ اس مصنف کا خیال ہے کہ کمال انسانی ایک ایسی چیز ہے جو دیانت، جرأت ایثار وغیرہ جیسی صفات سے ممتاز ہے۔ اور بیک نظر محسوس کی جا سکتی ہے۔ یہ ان صفات کا مجموعہ تو نہیں ہے مگر ان میں سے کسی ایک کی کمی بھی کمال میں نقص پیدا کرتی ہے۔ پھر یہ کمال انسانی ہے کیا چیز اور اس کے حصول کا طریقہ کیا ہے یہ اس مصنف نے کچھ نہیں بتایا اور نہ جدید مغربی تمدن کے کسی اخلاقی مصنف کے یہاں اس کا پتہ چلتا ہے۔

ابھی چند سال ہوئے کہ مغربی حکماء میں یہ بحث چل رہی تھی کہ انسان کے لئے سب سے بڑی نیکی کیا۔ اور شجاعت، سخاوت، ایثار وغیرہ کی صفات ایک ایک کر کے اچھالی اور گرائی جا رہی تھیں مگر مدتوں بحث و تمحیص کے باوجود بھی یہ مسئلہ طے نہ ہو سکا کہ مختلف انسانی صفات میں سب سے اعلیٰ صفت کونسی۔

اِنسان کامل

اِس سے پیشتر مَیں ایک مضمون میں نبی کریم صلعم کی بعض انسانی صفات پر کچھ لکھ چکا ہوں۔ اِس مضمون میں مَیں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ نبی کریم صلعم ایک کامل انسان تھے۔ غالباً اس کے بتانے کی ضرورت نہیں کہ "کامل" صیغۂ تفضیل نہ ہونے کے باوجود تفضیلی صفات پر حاوی ہے اور ایک خاص دائرہ کے اندر خوبیوں کا بدرجہ اتم موجود ہونا اور نقائص سے پاک ہونا کمال کہلاتا ہے۔ خاص دائرہ کے اندر اس لئے کہا گیا ہے کہ کسی چیز کا کامل ہونا یہ نہیں ہے کہ جو خامیاں اور کمزوریاں اس جنس کی فطرت میں ہے اُن سے بھی وہ مبرّا ہو جائے۔ جس طرح ماہ کامل کا تصوّر صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنے دائرہ میں ہر قسم کی تابانی رکھتا ہو اور اس کی نورانیت اِس درجہ تک پہنچی ہو جس کی اُس سے توقع کی جا سکتی ہے۔ یہ تصوّر نہیں کیا جا سکتا کہ ماہ کامل بے داغ ہو جائیگا یا اس کی روشنی سورج کی روشنی کے برابر ہو جائیگی۔ اسی طرح ایک انسان کا کمال یہ نہیں ہے کہ وہ خدائی کا دعوےٰ کرنے لگے۔ بلکہ انسانیت کے دائرہ کے اندر فطرت انسانی کی خامیوں اور کوتاہیوں کے ساتھ وہ اعلےٰ صفات انسانی کا حامل ہو اور رذیل صفات سے مبرّا ہو۔ اِن حالات میں ہم انسان کامل کا تصوّر کرتے وقت کسی مافوق الفطرت ہستی کا تصور نہ کرینگے بلکہ ایک عملی دُنیا میں رہنے والی اور انسانی قیود و حدود کے اندر محدود ہستی کا خیال کریں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان تمام شرائط و قیود و حدود کے ساتھ انسانی کمال کے لئے کون سی خوبیاں درکار ہیں۔ میرا ارادہ تھا کہ اس مبحث پر مذہبی رنگ سے الگ ہو کر بحث کروں مگر جا و بے جا نظر ڈالنے اور زمانہ حال و ماضی کی تمام نظریات پر غور کرنے کے بعد مجھے صاف مایوسی ہوئی اس لئے مجھے اسلام کے

سوا اور کہیں ان صفات کا تعین نہ ملا اور چونکہ اس حقیقت کا احساس ہوا کہ اسلام کے سوا کسی مذہبی یا اخلاقی تعلیم نے اس کا دعوے بھی نہیں کیا کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط واقعہ یہ ہے کہ تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب تھا جس نے کمالات انسانی کے صفات معین کئے اور اس عالم میں بسنے والوں کے لئے عملی زندگی میں حصول کمال کے نتائج عمل راستے بتائے۔ اور اس کا اعتراف غیر مسلموں کو بھی ہے۔ چنانچہ مہاتما گاندھی نے فرمایا ہے کہ عملی اصول کے لحاظ سے اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو انسانی فطرت پر پورا اترتا ہے۔ قدیم ہندو سنسکرتی تمدن نے حصول کمالات انسانی کا جو نظریہ قائم کیا وہ دنیا کی زندگی میں ناقابل حصول تھا اور اگر کسی سرزمین کے سامنے باستثنائے ترک لذات اور رہبانیت کے وہ طریقے انتہائی کرب جن کے بغیر اس تمدن کے موجب کوئی انسان کامل نہیں بن سکتا۔ تو یہ سرزمین چند ہی برسوں میں ویران ہو جاتے اور شہر و بلاد کی ساری سرگرمیاں ناپید ہو جائیں۔ مغرب کا جدید تمدن اپنے سرے پر پہنچ گیا ہے اور اس نے دنیا آباد رکھنے کے تو سارے سامان مہیا کرنے کی کوشش کی مگر اس دنیا سے انسانی کمال کا تخیل گھٹتے گھٹتے اب بالکل کم ہو گیا اور آج یہ مسئلہ زیر بحث ہے کہ انسانیت کا کمال ہے کیا چیز۔ ایک مشہور مصنف آر۔ ایس۔ فورمین اپنی کتاب "گریٹ کرسچینز کے دیباچہ میں لکھتا ہے کہ

"یہ امر مشتبہ ہے کہ آیا عظمت و کمال کی کوئی آفاقی بخش تعریف ملتی ہے"۔ اس مصنف کا خیال ہے کہ کمال انسانی ایک ایسی چیز ہے جو دانش، جرأت ایثار وغیرہ جیسی صفات سے ممتاز ہے۔ اور بیک نظر محسوس کی جا سکتی ہے۔ یہ ان صفات کا مجموعہ تو نہیں ہے مگر ان میں سے کسی ایک کی کمی بھی کمال میں نقص پیدا کر دیتی ہے۔ پھر یہ کمال انسانی ہے کیا چیز اور اس کے حصول کا طریقہ کیا ہے یہ اس مصنف نے کچھ نہیں بتایا اور نہ جدید مغربی تمدن کے کسی اخلاقی مصنف کے یہاں اس کا پتہ چلتا ہے۔

ابھی چند سال ہوئے کہ مغربی حکماء میں یہ بحث چل رہی تھی کہ انسان کے لئے سب سے بڑی نیکی کیا ہے اور شجاعت، سخاوت، ایثار وغیرہ کی صفات ایک ایک کر کے اچھالی اور گرائی جا رہی تھیں مگر متوں کی بحث و تمحیص کے باوجود بھی یہ مسئلہ طے نہ ہو سکا کہ مختلف انسانی صفات میں سب سے اعلیٰ صفت کونسی ہے

اِنسان کامل

اس سے پیشتر میں ایک مضمون میں نبی کریم صلعم کی بعض انسانی صفات پر کچھ لکھ چکا ہوں۔ اس مضمون میں میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ نبی کریم صلعم ایک کامل انسان تھے۔ غالباً اس کے بتانے کی ضرورت نہیں کہ "کامل" صیغہ تفضیل نہ ہونے کے باوجود تفضیلی صفات پر حاوی ہے اور ایک خاص دائرہ کے اندر خوبیوں کا بدرجہ اتم موجود ہونا اور نقائص سے پاک ہونا کمال کہلاتا ہے۔ خاص دائرہ کے اندر اس لئے کہا گیا ہے کہ کسی چیز کا کامل ہونا یہ نہیں ہے کہ جو خوبیاں اور کمزوریاں اس چیز کی فطرت میں ہیں اُن سے بھی وہ مبرا ہو جائے۔ جس طرح ماہ کامل کا تصور صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنے دائرہ میں کسی قسم کی خامی رکھتا ہو اور اس کی نورانیت اس درجہ تک پہنچی ہو جس کی اس سے توقع کی جا سکتی ہے۔ یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ ماہ کامل بے داغ ہو جائیگا یا اس کی روشنی سورج کی روشنی کے برابر ہو جائیگی۔ اسی طرح ایک انسان کا کمال یہ نہیں ہے کہ وہ خدائی کا دعوےٰ کرنے لگے۔ بلکہ انسانیت کے دائرہ کے اندر فطرت انسانی کی خامیوں اور کوتاہیوں کے ساتھ وہ اعلےٰ صفات انسانی کا حامل ہو اور اسفل صفات سے مبرا ہو۔ ان حالات میں ہم انسان کامل کا تصور کرتے وقت کسی مافوق الفطرت ہستی کا تصور نہ کرینگے بلکہ ایک عملی دُنیا میں رہنے والی اور انسانی قیود و حدود کے اندر محدود ہستی کا خیال کریں گے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان تمام شرائط و قیود و حدود کے ساتھ انسانی کمال کے لئے کون سی خوبیاں درکار ہیں۔ میرا ارادہ تھا کہ اس مبحث پر مذہبی رنگ سے الگ ہو کر بحث کروں مگر چاروں طرف نظر ڈالنے اور زمانہ حال و ماضی کی تمام نظریات پر غور کرنے کے بعد مجھے سخت مایوسی ہوئی اس لئے مجھے اسلام کے

بنا پر معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا ایمان درجہ کمال تک پہنچا ہوا تھا اور اسلئے آپ بدرجۂ اتم انسان کامل تھے اور آپ کا ہر قول اور ہر فعل اس ایمان اور اس کمال کا مظہر تھا۔

اب میں اس نظری استدلال کو عملی نقطۂ نظر سے واضح کرنا چاہتا ہوں کہ ایمان باللہ میں کمال حاصل کرکے حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح اپنے عمل سے اور اپنے ہر کارنامہ سے انسان کامل ہونے کا ثبوت دیا یہاں میں مذہبیت کے رنگ سے ذرا ہٹ کر ایک دنیادار انسان کی طرح آپ کی زندگی پر نظر ڈالونگا۔ اسلئے کہ مذہبی حیثیت سے تو ہمیں غور و فکر اور دلیل و حجت کے تمام مدارج سے گزر کر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آپ ہمارے لئے ایک بہترین نمونہ یا اسوۂ حسنہ تھے۔ مگر میں اسوقت یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہی لئے نہیں یعنی مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے اور ہر مذہب و ملت و نسل و قوم کے لئے آپ کی زندگی ایک کامل ترین انسان کا بہترین نمونہ ہے۔

ذرا آپ غور کیجئے کہ اگر کسی وقت خدانخواستہ آپ پر ہر طرف سے نرغہ اعدا ہو اور مصائب و تکالیف کی بارش ہو رہی ہو اور عزیز و احباب سب دشمن ہو رہے ہوں اور کوئی یار و مددگار نظر نہ آتا ہو اس وقت آپ کا کوئی بااثر عزیز آپ کے سر پر ہاتھ رکھ کر آپ سے اپنا طرز عمل بدلنے کی خواہش کرے تو آپ کیا کرینگے۔ ہمارے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت نبوت کے ابتدائی دور میں یہ صورت پیش آئی کہ آپ کی ساری قوم آپ کی دشمن ہو رہی تھی اور آپ کے ہمراہیوں کا مختصر گروہ شدید مظالم کا شکار ہو رہا تھا۔ خود آپ کے لئے ایذا دہی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا تھا۔ اس وقت ایک شفیق چچا نے آپ کے سر پر ہاتھ رکھ کر یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ تبلیغ اسلام سے باز آجائیں، تو آپ نے بلا تامل فرمایا کہ چچا جان آپ بھی میرے سر سے حفاظت ہٹا لیں مگر میں راہ حق پر لوگوں کو دعوت دینے سے باز نہ رہونگا۔ اس سے زیادہ معنی خیز وہ واقعہ ہے کہ جب آپ سے نمائندۂ مکہ کے ایک نمائندہ وفد نے کہا کہ اے محمدؐ اگر آپ کو حکومت کا شوق ہے تو ہم آپ کو اپنا سردار بنا لینگے اور آپ کے ہر حکم کی تعمیل کرینگے۔ اگر آپ دولت کے خواہاں ہیں تو ہم سیم و زر کے انبار لگا دینگے۔ اگر آپ تعیش کے طالب ہیں تو ہماری قوم کی خوبصورت سے خوبصورت لڑکیاں آپ سے عقد کر لینگی اور ان سب کے عوض میں ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ اپنی تبلیغ چھوڑ دیں۔ نبی کریم صلعم نے اس پر بہ فرمایا اگر میرے ایک ہاتھ

اور پھر ہر منفرد صفت کی تحلیل و تشریح نے قضیہ کو اور زیادہ کنجلک بنا دیا۔ حتیٰ کہ تمام صفات انسانی غیر معین ہو گئیں اور آج تو ایک مغربی فلسفی حیرت سے یہ سوال کر رہا ہے کہ جس چیز کو ہم عرف عام میں سچائی کہتے ہیں وہ آخر ہے کیا چیز۔

اس تاریکی میں اسلام روشنی دکھاتا ہے جس سے آج سے بہت پہلے اس مسئلہ کو واضح اور متین طور پر حل کر دیا تھا۔ قرآن شریف کہتا ہے کہ :-

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من اٰمن باللہ الخ

(ترجمہ) یہ نیکی نہیں ہے کہ آپ اپنا منہ مشرق کی طرف یا مغرب کی طرف کر لیں بلکہ نیکی یہ ہے کہ آپ اللہ پر ایمان لائیں۔

اس کے بعد چند اور نیکیاں شمار کرائی گئی ہیں۔ لیکن اٰمن باللہ کو مقدم رکھ کر بتا دیا گیا کہ سب نیکیوں سے بڑھی ہوئی نیکی بلکہ تمام نیکیوں کی بنیاد اللہ پر ایمان لانا ہے۔

ہمیں پر یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اسلامی ایمان کا تخیل مسیحی فیتھ (عقیدہ) Faith کے تخیل سے مختلف ہے۔ فیتھ ایک بے نور اور بے حس چیز ہے اور ایمان ایک زندہ روشنی ہے جو نیک راستہ کی ہدایت کرتی ہے اور انسان کی جملہ صفات کی کمال کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ فیتھ دلیل و حجت سے بے نیاز ہے اور ایمان منطق کے تمام مدارج سے گزر کر حاصل ہوتا ہے اور اسلامی تعلیم کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو عقل و فکر کی روشنی کو گل کر کے جبراً دماغ میں ٹھونسا جائے۔ عملی پہلو اس کا یہ ہے کہ جو شخص ایمان باللہ میں پختہ ہوگا وہی محاسبہ سے۔ خائف اور خدمت خلق میں پیش پیش ہوگا۔ مثلاً آپ اس آیۂ قرآنی کی تلاوت کریں جو ہر مسلمان کی زبان پر ہوگی۔

ارأیت الذی یکذب بالدین فذالک الذی یدع الیتیم ولا یحض علی طعام المسکین۔

(ترجمہ) آپ کو معلوم ہے کہ دین کو جھٹلانے والا کون ہے۔ یہ وہ ہے جو یتیم سے بے خبر ہو اور محتاج کو کھانا دینے کی رغبت نہ رکھے۔

غرضکہ انسانیت کا کمال از روئے اسلام ایمان باللہ کے مدارج طے کرنے پر حاصل ہوتا ہے اور وہ مدارج انسان کی روزانہ عملی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے حالات مطالعہ کرنے

واقعات بیشمار ہیں اور ان کا لکھنا اگر شمار بھی ذکر کیا جائے تو کئی ضخیم کتابیں ہو جائیں تاہم چند واقعات یہاں پر بیان کرنا ہوں غزوۂ نجد سے واپسی کے بعد آپ نے ایک مقام پر پڑاؤ کیا۔ یہاں بہت سے درختوں کے جھنڈ تھے صحابہؓ درختوں کے سائے میں ادھر اُدھر سو رہے تھے، آپ نے بھی ایک درخت کے نیچے تنہا استراحت فرمائی اور اپنی تلوار درخت سے لٹکا دی۔ ایک بدوی جو اسی تاک میں تھا چپکے سے آیا اور آپ کی تلوار اُٹھا کر نیام سے باہر کی۔ اتنے میں آپ بیدار ہو گئے اور دیکھا تو ایک بدوی تیغ بکف کھڑا ہے۔ بدو نے پوچھا کہ اے محمدؐ اب مجھ سے تم کو کون بچا سکتا ہے؟ جواب دیا، "اللہ" اور اس ایک پُر اطمینان دل سے نکلے ہوئے لفظ نے بدو کو بے قابو کر دیا اور تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے بہت محبت تھی مگر افلاس کی وجہ سے حضرت فاطمہؓ کو گھر کے سارے کام کاج اپنے ہاتھ سے کرنے پڑتے تھے۔ حتیٰ کہ چکی پیستے پیستے آپ کے ہاتھ زخمی ہو جاتے تھے۔ ایک دن آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور فرمایا کہ فلاں جنگ میں جو کنیزیں آئی ہیں اُن میں سے ایک مجھے مل جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تک اصحاب صفہ کا بندوبست نہ ہو جائے میں کسی اور طرف توجہ نہیں کر سکتا۔ یہ اصحاب صفہ نہایت ہی تنگدست اور مفلوک الحال تھے اور آپ نے اپنے اہل خاندان کی حالت اُن سے بڑھ کر کھنا گوارا نہ کی اور اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اُمت اور اپنی اولاد کے درمیان آپ کوئی امتیاز نہیں روا رکھتے تھے

شفقت اور ترحم کا مادہ اتنا تھا کہ مجرموں کو سزا دیتے وقت بھی ملحوظ رہتا تھا۔ ایک دفعہ قبیلہ غامد کی ایک عورت آئی اور بیان کیا کہ میں نے بدکاری کی ہے آپ مجھے سزا دیں۔ آپ نے فرمایا کہ واپس جاؤ پھر آنا۔ دوسرے دن وہ پھر آئی اور کہا کہ مجھے حمل رہ گیا ہے۔ آپ نے پھر فرمایا کہ واپس جاؤ۔ تیسرے دن وہ پھر آئی تو آپ نے فرمایا کہ بچہ پیدا ہونے تک انتظار کرو۔ جب بچہ پیدا ہوا تو وہ پھر حاضر ہوئی۔ مجبوراً آپ نے سزا کا حکم دیا۔ دوران سزا میں ایک صحابی نے اُسے گالی دی تو آپ نے فرمایا کہ زبان کو روکو، اُس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر جبراً محصول لینے والا بھی یہ توبہ کرتا تو بخش دیا جاتا۔ آپ نے یہاں پر جبراً محصول لینے والوں کا ذکر کیا اس سے ہمارے زمینداروں کو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔

(ابوداؤد۔ کتاب الحدود)

آجکل کی تہذیبوں میں حُبِّ وطن کو بہت بلند درجہ دیا جاتا ہے اور بعض لوگ اسے تمام نیکیوں سے اسے ارفع سمجھتے ہیں۔ مگر اسلام نے یہاں بھی جو نظریہ پیش کیا اور خود ہمارے سرور کائنات صلعم نے اپنے عمل سے جس کی مثال

میں سورج اور ایک میں چاند رکھ دیا جائے تو بھی میں دین حق کی تبلیغ سے باز نہ آؤں گا"۔

نیکی اور بدی کا تخیل تمام مذاہب میں ہے اور اس کے لحاظ سے ہر مذہب و ملت میں بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں۔ چنانچہ ہمارے ہندو ستانیوں کی بعض شخصیتیں زمانہ ماضی و حال کی ایسی ہیں جو عمدہ انسانی سطح پر بہت بلند ہیں۔ لیکن ایک ایک نیکی اور بدی کو لیجئے اور اسلام کی تعلیمات میں اُن کی تعریف دیکھئے تو وہ کمالات انسانی کا زیادہ مظہر ہونگی اور جب ان کی عملی تشکیل پر نظر ڈالئے تو اتنی بلندی آپ کو دنیا کی کسی تعلیم میں نہ ملیگی۔ مثلاً انتقام کی مثل مسیحی تعلیم میں قطعاً فطرت انسانی کے خلاف تھی۔ یعنی اگر کسی شخص کسی کے داہنے گال پر طمانچہ مارے تو بایاں گال بھی اُس کے سامنے کر دیا جائے۔ اسلام نے جان کے بدلے جان آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، اور کان کے بدلے کان کا اصول مقرر کر کے فطرت انسانی کے تقاضے کو بھی مطمئن کیا اور انصاف کی حدود کو بھی قائم رکھا اور پھر یہ بھی کہہ دیا کہ اگر معاف کر دو تو یہ سب سے بہتر ہے۔ یہ درجہ بدرجہ کمال کی طرف رہنمائی تھی جو سرور کائنات صلعم کی زندگی میں اس درجہ پر نظر آئیگی جسے اعلیٰ ترین کمال کا درجہ کہا جائیگا۔

امن و صلح کے وقت اور فتح و شکست کے موقعہ پر کمزوروں کی مدد اور طاقتوروں سے سلوک میں دوستوں سے مدارات اور دشمنوں سے برتاؤ۔ وعدہ کا ایفا اور معاہدات کا پاس، بیماروں سے ہمدردی اور حاجتمندوں کی امداد میں غرضکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر درجہ میں ہمارے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طرز عمل اختیار کیا وہ ایک انسان کامل کے طرز عمل کا بہترین نمونہ تھا اور یہی نمونہ ہمیشہ آپ کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔

یہ انسان دنیا سے الگ ہو کر جنگل میں زندگی بسر کرنے والا نہ تھا بلکہ ہماری آپ کی طرح بیوی بچے رکھنے والا اور زندگی کے تمام مراحل و مراتب طے کرنے والا تھا۔ مگر آپ سے آپ چاہے مکہ کی گلیوں میں بے یار و مددگار اور عقوبت شناس ہستی کی طرح دیکھیں یا مدینہ میں ایک پناہگزین کی حالت میں جو دشمن قبائل کی سازشوں سے بیزار ہے یا بحیثیت ایک فاتح کے اہل مکہ کی سزا و جزا کے احکام صادر کرتا ہوا، یا غار ثور میں صرف ایک ہمراہی کے ساتھ نرغۂ اعداء میں محصور، غرضکہ جس حال اور جس حیثیت میں آپ سے دیکھینگے اس کا طرز عمل عام سطح انسانی سے بلند ہوگا اور کامل ترین انسانی ہستی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوگا۔

اس بحث کا ایک اور پہلو

اوپر کی بحث سے یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ بنی نوع انسان کو صحیح معنی میں انسان بنانے کے لئے ایک مکمل ضابطہ حیات کی ضرورت ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کا یہ سب سے بڑا احسان ہے کہ اس نے [illegible] ایک ایسی شخصیت کے سپرد یہ کام کیا جو [illegible] کے [illegible] کی سنت [illegible] ہے۔ ایک [illegible] غیر فطری سمجھا جائیگا [illegible] صحیح نقطۂ یہیں لیا اور نبی کریم کی صورت میں اس کا عملی نمونہ ہمارے سامنے رکھ دیا۔ یہ بات کسی مذہب کو حاصل نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیت آج ایک غلط اور فانی چیز معلوم ہوتی ہے۔ اس کے روحانی اصول منجمد ہو گئے اور تخیلات عالیہ کی رو میں اس طرح بہتے چلے جا رہے ہیں جس طرح خس و خاشاک اور شجر و حجر کسی بحر موّاج کی طغیانی میں بہہ جاتے ہیں۔ آج عیسائیت کے بڑے بڑے رہنما اس بات پر غور کر رہے ہیں کہ عیسائیت کی نصرانی بنیاد جو اب کھوکھلی ہو چکی ہے۔ اس کو کوئی نئے اصولوں پر قائم کیا جائے کہ روحانیت اور فلسفہ کے بے پناہ تخیلات اسے مسمار نہ کر سکیں لیکن انہیں کامیابی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ عیسائیت کے روحانی اصول ہی ایسے ہیں جو عملی زندگی کی کسوٹی پر کھرے اور صحیح نہ اتر سکے۔ نئی مذہبیت ہر فلسفی انسان کو مجبور کر رہی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو نئے طریق پر ڈھالے وہ اس سے سوال کرتی ہے کہ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ دنیا کے گوناگوں مذہبی روحانی اصولوں میں کوئی ایسا اصول بن سکے جو عقیدہ و ایمان کے لئے نہایت ہی مکمل اور اٹل ہو؟ مگر ہم ساڑھے تیرہ سو برس پہلے سے یہ رنگ اور یہ [illegible] اصول حضرت نبی کریم کی زندگی اور اسلام کی سچی تعلیم میں پاتے ہیں۔ جس کو اب عیسائی محققین نے بھی محسوس کر لیا ہے۔ چنانچہ بشپ گور، بشپ بارنس۔ ڈین انج اور ہسٹنگ ریشڈل جیسی نئی عیسائیت کو دنیا میں لانا چاہتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام کو سامنے رکھ کر بنائی جا رہی ہے۔ مسیحی محققین

قائم کی وہ دنیائے عمل کے لئے موزوں ترین مانا جائیگا۔ اسلامی برادری کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے اور اس میں فرقہ ملت نسل یا مملکت و بلاد کا کوئی امتیاز نہیں ہے، بلکہ مشرقی اور مغربی، گورا اور کالا، زنگی اور فرنگی جو بھی اسلام کے دائرہ میں ہے وہ مساویانہ اخوت کے رشتہ میں منسلک ہے، مگر اسی کے ساتھ ہمدردی اور مواخاۃ کے مراتب رکھے گئے ہیں اور قریب کی چیز چھوڑ کر دور کی چیز پکڑنا ہمارے لئے روا نہیں ہے جس طرح ہم اپنے اقربا کو احتیاج میں رکھ کر غیروں پر اکرام و احسان کی بار نہیں کر سکتے اسی طرح اپنے وطن کی ہمدردی اور محبت بھی ہمارے لئے بمقابلہ غیر وطن کے مقدم ہے۔ یہی حفظ مراتب اس وطنیت کی مذمت کرتا ہے جو اٹلی کو مملکت حبشہ کے ہضم کر جانے پر آمادہ کرے۔ بلکہ ایک ایسا تخیل پیدا کرتا ہے جو مقتضائے بشریت کے مطابق اور بہترین خدمت پر آمادگی کی بنیاد ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت مکہ معظمہ سے ہجرت کے لئے روانہ ہوئے ہیں تو اس شہر کی طرف دیکھ کر فرمایا تھا کہ:-

"مکہ تو مجھ کو تمام دنیا سے زیادہ عزیز ہے لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے"۔ پھر جب فتح مکہ کے وقت ایک اسلامی فوج کے علمبردار نے یہ آواز لگائی کہ "آج گھمسان کا دن ہے۔ آج مکہ حلال کر دیا جائیگا"۔ تو آپ اس پر ناراض ہوئے اور اس علمبردار سے علم لیکر دوسرے کو دیدیا اور فرمایا کہ "آج مکہ کی عظمت کا دن ہے"۔ یہی جذبہ وطنیت تھا جو مسلمانوں کے خمیر میں داخل ہوگیا اور عرب میں بمثل زبان زد خاص و عام ہوگئی کہ حب الوطن من الایمان۔

انسانی ہمدردی کا جذبہ بھی اعلیٰ جذبات میں سے ہے۔ اور اس میں بھی ہمارے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم درجہ کمال پر پہنچے ہوئے تھے۔ اور یہ ہمدردی اور حسن سلوک صرف مسلمانوں تک محدود نہ تھا بلکہ بمقتضائے رحمۃ للعالمین کفار و مشرکین سے بھی آپ ہمدردی اور حسن سلوک کرتے تھے۔

آپ کی ہمدردی انسانی کے بے شمار واقعات ہیں جن میں سے دو ایک ہم آئندہ مضمون "امن و رحمت کا پیغمبر" میں بیان کریں گے۔ اس موقعہ پر جو کچھ مختصر عرض کیا گیا اس سے ثابت ہو گیا کہ نبی کریم صلعم ایک انسان کامل تھے اور کامل انسانوں میں اکمل۔ سچ ہے ؎

آں سرور کائنات و محمود جہاں — بود سبب سرآمد صفات انساں
المال بشر رہین حسن عملش — بل آدم بذات پاکش نازاں

امن و رحمت کا پیغمبر

آج کل جبکہ دنیا آگے بڑھتے بڑھتے ایک ایسی منزل پر پہنچ گئی ہے جہاں سے فتنہ و فساد اور شور و شر کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم مسلمانوں کو پکار پکار کر اس راستہ پر لائیں جو امن و سماجی اور ترقی و فلاح کا راستہ ہے۔ اس کے لئے ہمیں ذرا پیچھے ہٹ کر اس زندگی پر نظر ڈالنی چاہیئے جس نے تاریک دنیا میں اسلام کی روشنی پھیلائی اور رشد و ہدایت کا وہ راستہ بنایا جس پر چلکر مسلمانوں نے مادی اور روحانی زندگی کے اعلیٰ ترین منازل طے کئے اور آج بھی جہاں ترقی اور تمدن کی روشنی ہمیں ملتی ہے وہ اسی شمع ہدایت سے نکلی ہوئی ہے۔

دنیا اپنی اسلام دشمنی میں جو چاہے کہے لیکن انصاف بین نگاہیں دیکھ سکتی ہیں کہ موجودہ دور میں بھی جو قوم ترقی کی طرف رُخ کرتی ہے وہ اسی اسلامی تعلیم کے کسی نہ کسی حصہ کو اختیار کرتی ہے۔ ہندوستان ہی میں اچھوت اودھار یا دیہی اصلاح یا عقد بیوگان یا قانون وراثت یا ترک سکرات موضکہ کوئی رواج یا دستور آج جب زمانہ حال کی ضروریات پر منطبق کیا جاتا ہے تو یہی اسلامی تعلیم مشعل راہ بنتی ہے پھر یہ ہماری بدنصیبی نہیں تو کیا ہے کہ ہم اسلام کی کامل تعلیم کو چھوڑ کر اپنی فلاح و بہبود کی راہیں دوسری ناقص نظریات سے مستعار لیں اور اس اسوۂ حسنہ پر نظر نہ ڈالیں جو مجمع کمالات انسانی کا اعلیٰ ترین نمونہ تھا اور جس نے آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے ابتدا سے انتہا تک کی اعلیٰ ترین ترقیوں کا راستہ بتا دیا تھا۔

مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اسلام ایک عملی مذہب ہے جس میں توہمات اور رسومات کو دخل نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اس کا بنیادی عقیدہ ایمان بھی مسیحی فیتھ کی طرح اندھا دھند نہیں ہے بلکہ بیّن شواہد اور مستحکم دلائل پر مبنی ہے۔ اسلامی تعلیم کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو عقل و فکر کی روشنی کو گل کر کے جبراً دماغ میں ٹھونسا جائے۔ بلکہ قرآن بار بار پکار کر غور و فکر تدبر اور استدلال کی دعوت دیتا ہے اور دیگر مذاہب عالم

یہ تسلیم کرنے لگے ہیں کہ دیوتا، اوتار، تثلیث اور کفارۂ گناہ کے ادعائی اصول انہیں اصولوں
لئے گئے ہیں جو قبل عیسائیت دنیا میں جاری تھے۔ چنانچہ ایک محقق لکھتا ہے کہ "عیسیٰ
نے کبھی خدائیت کا دعوےٰ نہیں کیا۔ اُن کی کسی بات سے نہیں معلوم ہوتا کہ ان کا تعلق خ
اس کے علاوہ رہا ہو جو ایک انسان کا خدا سے ہوتا ہے۔" اسی طرح اس اصول کے متعلق
کہ "حضرت عیسیٰ نے اپنی جان دیکر اپنے معتقدین کا کفارہ گناہ کر دیا۔" کہا جاتا ہے کہ حض
عیسیٰؑ نے کبھی اس کا دعوےٰ نہیں کیا۔ اور آج اس عقیدہ کی کوئی وقعت نہیں رہی
کی حقیقت کو بھی ریاضی اور فلسفہ نے بے نقاب کر دیا ہے۔ چنانچہ مشہور مصنف نیز
(NITZECHE) ایک سوال قائم کرتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے کن چیزوں سے انکار
پھر اس کا جواب دیتا ہے "ان تمام چیزوں سے جو آج عیسائیت کے نام سے دنیا میں
ہیں"۔ اس نے عیسائیت پر جو تنقیدیں کی ہیں وہ اسلامی اصول سے بہت کچھ مطابق
رکھتی ہیں۔ غرض ان تمام چیزوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الحقیقت اسلام نے
اصولوں کو دنیا میں زندہ و رائج کیا ہے۔ سچے مذہب کے وہی اصول تھے اور پیغمبر اس
نے جو نمونہ اپنی زندگی کا پیش فرمایا وہی ہر زمان و مکان کے لئے صحیح نمونہ زندگی بن
ہے۔ لہذا یہ بالکل صحیح اور عین حقیقت ہے کہ نبی کریم نے اپنی زندگی سے مذہبیت
ایک ایسا ارفع و اعلیٰ تخیل پیدا کر دیا جس کا مستقل نشان دنیا کی تاریخ و تمدن میں قا
اور ہر دور کے لئے روح پرور بنا رہیگا۔ اسلام سے پیشتر مذہبیت محض ایک
کی حیثیت میں رہی تھی۔ لیکن اسلام اور پیغمبر اسلام نے اس کو عملی جامہ پہنا کر یہ د
دیا کہ خدا کے خلیفہ کے لئے اس دنیا میں شاہراہ عمل کیا ہے!

اسلام دنیا کے لئے پیام امن و مواخاۃ لے کر آیا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نوع انسانی کے لئے رحمۃ للعلمین بنکر جلوہ گر ہوئے۔ چنانچہ اس کا ثبوت آپ کے اس طرز عمل سے ملتا ہے جو آپ نے اپنے دشمنوں اور ایذا رسانوں کے بارے میں اختیار کیا۔ اہل مکہ نے آپ کی ایذا رسانی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا اور ایسے ایسے مظالم آپ پر اور آپ کے ہمراہیوں پر کئے تھے جن کے خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں مگر جب ایک صحابی نے آپ سے کہا آپ ان کے لئے بددعا کریں تو آپ نے فرمایا کہ میں دنیا کے لئے لعنت نہیں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں (مشکوٰۃ و مسلم)

تو برائے وصل کردن آمدی
نے برائے فصل کردن آمدی

اسی طرح معرکہ احد میں کفار نے آپ پر حملہ اور دندان مبارک مضروب ہوئے مگر ان کے لئے بھی آپ نے دعا فرمائی کہ

اَللّٰھُمَّ اھْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ } اے اللہ ان کو ہدایت کر کہ یہ نادان ہیں۔

کفار طائف نے آپ کو ایذا دینے اور ذلیل و خوار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی اور جسم اطہر کو پتھروں کی بارش سے لہولہان کر دیا تھا اور پھر مسلمانوں سے برسر میدان معرکہ آرا ہوئے مگر ان کے لئے بھی آپ نے دعا فرمائی کہ "اے اللہ اہل طائف کو اسلام نصیب کر اور دوست بنا کر مدینہ میں لا"

اس سے بھی زیادہ پر اثر فتح مکہ کا واقعہ ہے جب آپ نے خطبہ فتح کے بعد مجمع پر نظر ڈالی جس میں جبابرہ قریش اور دشمنان اسلام تھے جنھوں نے تیغ و سناں سے پیکر قدسی کے ساتھ گستاخیاں کی تھیں جن کی زبانیں آپ پر کاہوں کی بوچھار کرتی تھیں۔ جنھوں نے آپ کی راہ میں کانٹے بچھائے تھے اور وعظ کے وقت آپ کی ایڑیوں کو لہولہان کر دیتے تھے جن کے حملوں کا سیلاب مدینہ کی دیواروں سے آ کر ٹکراتا تھا۔ جو مسلمانوں کو جلتی ہوئی ریت پر لٹا کر سینہ پر گرم پتھر رکھ دیتے تھے۔ اسوقت یہ مجمع ہزیمت خوردہ غنیم کی شکل میں آپ کے سامنے تھا اور آپ اس سے دریافت فرما رہے تھے کہ:۔

"تم کو کچھ معلوم ہے کہ میں تمہارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہوں"

کی طرح چند اصول موضوعہ پر دین کی تعلیم کا قصر نہیں کھڑا کرتا ۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو اسلام کے عقاید ا
ہر مذہب و فلسفہ سے ممتاز نظر آئیں گے اور عملی زندگی کے اعلیٰ ترین مادی اور روحانی مدارج طے کرنے کے
اتنا واضح برہان آپ کو کسی دیگر اخلاقی اور مذہبی نظریہ میں نہ ملے گا ۔

ذہن و فکر کی رسائی سے ایک اعلیٰ ترین تخیل کا نقشہ بنا لینا آسان کام ہے لیکن انسان کی فطری
خامیوں اور کوتاہیوں کو ملحوظ رکھ کر ایک اعلیٰ ترین خاکۂ عمل کا بنانا اتنا آسان نہیں ہے ۔ افلاطون
ایک نظری حیثیت سے مکمل سیاست اور معاشرت کا خاکہ مرتب کیا تھا لیکن کیا تاریخ عالم میں کوئی
بھی سوسائٹی کسی زمانہ میں بھی ایسی ملتی ہے جو افلاطون کے بنائے ہوئے خاکہ پر مبنی رہی ہو یا آج بھی کوئی
موجود ہے جو فلاح و ترقی کے لئے انسانی سوسائٹی کو اس نمونہ پر ڈھالنے کا خواہاں ہو ۔ اور ایک افلاطون
میں بہت سے مفکر اور فلسفی ہوئے جنھوں نے اپنے اپنے خیال کے بموجب انسانی سوسائٹی کا خاکہ بنا
ان کی نظریات یا تو انھیں کے دماغ و فکر میں پیدا ہو کر فنا ہو گئیں یا ان کے مقلدین کے محدود حلقے میں
زیر بحث رہیں یا زیادہ سے زیادہ چند دنوں نے عملی تجربہ کے بعد [illegible] ہیگل، میکاولی ۔
انتریو وغیرہ وغیرہ بہت سے نام اس سلسلہ میں لئے جا سکتے ہیں ۔ لیکن یہ نام تاریخ کے اوراق میں آ
اور نہ [illegible] کی نظریات نے مشرق و مغرب پر تسلط حاصل کیا اور زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ ان کی
معقولیت اور وضاحت [illegible] ہوتی گئی [illegible] آج بھی ترقی و فلاح کا بہترین قابل عمل راستہ [illegible] سمجھا جاتا ہے ۔
کہ اس پر عمل [illegible] کی کامیابی اور فوقیت [illegible] روشن کی
ثابت کی جا چکی ہے تو [illegible] نظر [illegible] موجودہ خلفشار و چپقلش
میں [illegible] دنیا پر [illegible] صدائیں ماند پڑ گئی
پیغمبر [illegible] صلی اللہ علیہ [illegible] اور اس کی تقلید کر کے ا
بزرگان [illegible] کی طرح [illegible] ہیں ۔

اس وقت ان کا موقع نہیں [illegible] سامنے [illegible] عقاید و اعمال پیش
لیکن ایک [illegible] آپ کی توجہ [illegible] تعلیمات کی اصل [illegible] ہے

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

بیشک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تمہارے لئے بہترین نمونہ ہیں۔

فی الحقیقت اسلامی تعلیم کی کامیابی اور سرفرازی کا اصلی راز اس کے قابل عمل ہونے میں ہے۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ تمام اسلامی اعمال کی بنیاد ہے اور اسی وجہ سے ترک لذات یا ترک دنیا کی اس میں گنجائش نہیں ہے لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ۔ نہ اس میں مسیحی رہبانیت کے اعمال ہیں اور نہ ہندو تیاگ کے عقائد۔ بلکہ اس دنیا میں انسانی گوشت پوست کی قیود کو تا ہیں میں زندگی بسر کرتے ہوئے روحانی و مادی بالیدگی و کمال کے راستے طے کرنے کے طریقے بتائے گئے ہیں۔ اور ہر طبقہ و حیثیت کے انسان کے لئے وہ ہدایتیں مہیا کر دی گئی ہیں جو اُسے گرد و پیش کے حالات میں ایک ممتاز اور ارفع ہستی بنانے میں معین ہو سکتی ہیں۔ جو شخص رحم و عفو کا دلدادہ ہو وہ اَحْسِنْ اِلٰی مَنْ اَسٰی (جو شخص بُرا سلوک کرے اس سے احسان کرو) کے اصول پر عمل کرے گا اور جس کا جذبۂ انتقام قوی ہوگا وہ،

اَلسِّنُّ بِالسِّنِّ وَالْاَنْفُ بِالْاَنْفِ وَالْعَيْنُ بِالْعَيْنِ (دانت کے بدلے دانت، ناک کے بدلے ناک، آنکھ کے بدلے آنکھ) کا اصول اختیار کرے گا مگر دونوں میں جو اصول مشترک رہیگا وہ یہ کہ جادۂ حق و انصاف سے کہیں پر قدم نہ ہٹنے پائے اور یہی مشترک اصول اسلامی تعلیم مواخاۃ کا سررشتہ ہوگا جو ایک مسلم کو دوسرے مسلم کا بھائی اور غیر مسلم کے ساتھ انصاف و احسان کرنے والا بنائیگا۔ یہ جادۂ حق و انصاف سخت سے سخت عداوت و دشمنی کی صورت میں بھی ہاتھ سے دینا جائز نہیں ہے۔

لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا۔ کسی قوم کی عداوت تمہیں اس کے ساتھ ناانصافی پر نہ آمادہ کرے۔ اس تعلیم کا نتیجہ تھا کہ فتح مکہ کے بعد اہل مکہ کو بلا لحاظ مذہب و ملت پورے پورے شہری حقوق دیدئے گئے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ یہود و مشرکین مدینہ سے مساوات کے معاہدے کئے گئے اور ان کی حرف بحرف پابندی کی گئی اور یہی وہ چیز تھی جو مشرکین کو باوجود ان کی اسلام دشمنی کے اپنے تنازعات میں پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم کو حکم بنائیں اور یہی چیز تھی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی ان کے جانشینوں کے لئے مشعل راہ رہی اور دشمنان اسلام سے بھی خراج تحسین وصول کیا بسا

اشقیا اور سنگدلوں کے اس مجمع نے جواب دیا کہ

"آپ شریف بھائی اور شریف برادر زادہ ہیں"

ارشاد ہوا کہ "جاؤ تم پر کچھ الزام نہیں۔ تم سب آزاد ہو"

اللہ اللہ۔ یہ رحم و کرم کا دریائے بے پایاں رحمۃ للعلمین کے سوا کیا کسی اور انسان کے دل میں ہو سکتا ہے اور کیا کوئی تاریخی ہستی ایسی بتائی جا سکتی ہے جس کا ظرف اتنا وسیع اور جس کا دل اتنا عظیم الشان ہو۔

مسٹر خالد لطیف گایا اپنی انگریزی کتاب "پرافٹ آف دی ڈیزرٹ" میں لکھتے ہیں کہ، "جو زمانہ امن میں نیک راستہ بتانے والا، حلیم الطبع مبلغ، روشن خیال مدبر، غیر جنبہ دار منصف اور رحم حکمراں ہو، جو شخص زمانہ جنگ میں اصول حرب کا ماہر، مستقل مزاج، غیر متزلزل اور ہر بات میں معقول اور عملی ہو۔ جس شخص کی تعلیم خود اس کے عمل کے مطابق ہو، جس کا مذہب فرشتوں کے لئے نہیں بلکہ انسانوں کے لئے ہو جس کا خدا غفور الرحیم ہو، ایسا شخص جس کی زندگی اُس کے متبعین کے لئے ایک کھلی کتاب ہو، جب وہ کوئی فیصلہ کرے تو علانیہ مشورہ کرے جس کے دل میں کوئی چور نہ ہو، اس کے متبعین اسے مشیر کار اور رفیق ہوں، جب وہ انہیں کسی عمل پر آمادہ کرنا چاہے تو پہلے خود اس عمل میں سبقت کرے چاہے عمل عورتوں سے سلوک یا جوا کے قبائل اور دشمنوں سے برتاؤ کے متعلق ہو۔ جب اس سے کوئی خطا ہو جائے اور خطا ہونا مقتضائے بشریت ہے، تو ندامت اور افسوس کا اظہار علی الاعلان کرے۔ وہ عبادت اس لئے کرتا ہے کہ لوگوں کو عبادت گذار بنانا چاہتا ہے۔ روزہ اسلئے رکھتا ہے کہ دوسروں سے یہی توقع رکھتا ہے۔ خیرات اس لئے کرتا ہے کہ لوگوں کو مخیر بنانا چاہتا ہے۔ غلاموں کو اس لئے آزاد کرتا ہے کہ اس کے متبعین اس کی تقلید کریں۔ وہ عقد کرتا ہے اور صاحب اولاد ہوتا ہے اس لئے کہ اُسے وہ دنیا کی زندگی کے لوازم میں شمار کرتا ہے، وہ خود اپنے ہاتھ سے کام کرتا ہے کہ محنت کی عظمت نمایاں ہو۔ یہ ہے شخصیت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بحیثیت انسان کے اور بحیثیت رسول اللہ کے اور بحیثیت فاتح حکمراں کے۔ اس کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ قرآن کریم پکار پکار کر کہتا ہے کہ:۔

نبی کریمؐ بہ حیثیت ایک مُصلحِ عالم کے

انسان اور دیگر حیوانات میں فرق یہ ہے کہ انسان فطرتاً مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ اس کی انفرادی زندگی اجتماعی تشکیل حیات کی ایک کڑی ہے۔ ہر انسان بہ حیثیت انسان ہونے کے ایک ناقابل احاطہ کُل کا جزو اور ایک عالمگیر موتمر انسانی کا ایک ذمہ دار رکن ہے۔ اس کا ہر عمل اس نظام اجتماعیت پر اثر انداز ہوتا ہے جس کو نظام عالم کہتے ہیں۔ اور یہ اپنے ہر قول و فعل میں انسانی سوسائٹی کے سامنے مسئول و جوابدہ ہے۔ یہ سلسلہ کائنات کی لامتناہی زنجیر باہمی کڑیوں کے ربط و ضبط کا نام ہے۔ اور کارگاہ حیات کی تمام تگ و دو اسی باہمی یکجہتی، اخوت و مساوات کی آئینہ دار۔ نوع انسانی اپنے عہد طفولیت میں دیگر حیوانات کی طرح انفرادی زندگی بسر کرنے کی خوگر تھی۔ اقتضائے معاونت و تعاون سے خاندانی زندگی کی ابتدا ہوئی۔ ربط اور بڑھا تو قبائلی زندگی کی تشکیل ہوئی۔ قبائل کے اختلاط سے قومی زندگی کی بنا پڑی۔ اور سب سے آخر اس دائرہ میں اتنی وسعت پیدا ہوگئی کہ تمام نوع انسانی ایک متحدہ سوسائٹی قرار پاگئی۔ یہی ارتقاء کی آخری کڑی تھی اور اسی نے نوع انسانی کو تمام حیوانات سے علیحدہ کرکے اہم ذمہ داری کا امین کیا گیا جس سے خدمت خلق اس کا اصل دین بن گیا۔ خوب کہا ہے ؎

چیست انسانی تپیدن زتپ ہمسائیگاں
وز سموم نجد در باغ عدن لرزاں شدن

انسان کے اس ربط و ضبط، میل جول، اشتراک عمل یا باہمی معاملات کا تقاضا تھا کہ اُن کی حفاظت و اصلاح کے لئے قوانین نافذ کئے گئے۔ ورنہ ایسی انفرادی زندگی کے لئے جس کا اثر کہیں متعدی نہ ہو آئین و ضوابط کی کیا ضرورت۔ یہی وہ قوانین و ضوابط اور حدود و قیود ہیں جنھیں مذہب کی اصطلاح میں

بیت المقدس کے بعد جن شرائط پر مسیحیوں کو ان کے معابد و املاک پر برقرار رکھا گیا۔ وہ آج کے ترقی یا
میں بھی مفتوح اقوام کے ساتھ روا نہیں رکھا جاتا اور اسپین کے عیسائیوں کے ساتھ قرطبہ وغر
حکومتوں نے جو رواداری اور حسن سلوک برتا تھا وہ تاریخ عالم کی کسی فاتح قوم نے محکوموں کے ساتھ
خود اسی اسپین میں جب عیسائیوں کی حکومت برسر اقتدار ہوئی تو مسلمانوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر قتل
اور اسلام کا نام اس خطۂ زمین سے مٹا دیا گیا۔

ہمارا مذہب ایک زخم پر پھاہا رکھنے کے بعد دوسرا زخم پیش کر دینے کی تعلیم نہیں دیتا لیکر
کی رواداری اور انصاف میں دنیا کے لئے وہ پیام امن و ترقی ہے کہ آج دنیا اگر اسے مان لے تو تمام تنا
و قضایا ختم ہو جائیں اور جس اقتصادی اور دیگر کشمکشوں میں آج اقوام عالم مبتلا ہیں وہ یکلخت مٹ جائیں
کون ہے جو دنیا کو یہ پیغام پہنچائے کہ انسانی دکھ درد اور قلوب کی بےچینی کا علاج مجلس اقوام کے پاس نہیں۔
نہ ان کانفرنسوں اور کمیٹیوں میں ہے جو آئے دن بیٹھتی اور اٹھتی رہتی ہیں بلکہ اس کتاب کے چند اوراق میں
نے ایک مرتبہ دنیا کی کایا پلٹ کر دی تھی اور جو آج بھی یہ استعداد رکھتی ہے کہ ظلمات کو درخشانیوں سے بدل
اور کرب کو لذت بنا کر روحانی مسرتوں کے دروازے کھول دے۔

واقعات بہت ہیں اور ان کا ذکر چھیڑ کر میں اُن کی رو میں بہت چلا جاؤں گا۔ مگر اس سے کچھ حاصل
ہے۔ مختصراً میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ روحانی اور مادی مسرات اور قلبی طمانیتوں کا جو منبع ہمارے
یہاں خاک آلود جزدانوں میں بند رکھا ہوا ہے۔ اُسے خدا کے لئے آپ کھولیں اور اس کی بین دفتین
روشن آیات کو پڑھیں سمجھیں اور غور کریں اور ایک بدحواس دبے قرار دنیا کو امن و ترقی کا سبق دیں
چند ہی لوگ تھے جنھوں نے عرب کے صحرا سے اٹھکر ساری دنیا میں روشنی پھیلائی تھی۔ آج ہندوستان
کے آٹھ کروڑ مسلمانوں میں سے کیا اتنے افراد بھی نہیں مل سکتے جو اس روشنی کے علمبردار بن کر تاریخ پیشید
اعادہ کریں اور اپنی ہی تکالیف کو نہیں ساری دنیا کی مشکلات کو حل کریں۔

پر ترجیح دی گئی ہے اور حق العباد میں مذہبی تفریق تک روا نہیں رکھی گئی۔ سارا اسلامی آئین جو ہمارے نبی کریم کے ذریعے ہم کو ملا ہے وہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں حق العباد کی اہمیت پر زور دیتا ہے اور اسے جزو ایمان بتاتا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ ارءیت الذی یکذب بالدین فذلک الذی یدع الیتیم ولا یحض علی طعام المسکین ۵

اس آیتہ میں خدمت خلق پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ اسے صرف دین کا مرادف ہی نہیں بتایا گیا ہے بلکہ یہاں تک کہا گیا ہے کہ جو لوگ آپس میں معمولی مراعات نہیں کر سکتے ان کی نماز بیکار ہے۔

ایک مصلح ہونے کے لئے سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ اس کا تخیل خلق کے متعلق عالمگیر ہو نبی کریم کی ساری تعلیم اسی اصول پر مبنی تھی۔ پہلی چیز دیکھئے کہ تمام خلق کو خدا کی تسبیح کے دانوں میں پرو دیا۔ تو ظاہر ہے کہ سب دانے ایک ہو گئے۔ چنانچہ خدا کا تخیل یہ ہے کہ وہ رب العالمین ہے یعنی ایک خدا سارے جہان پر حاوی ہے اور سارے جہان کا پروردگار اور خود نبی کریم کو رحمۃ اللعالمین کہا گیا ہے۔ یعنی آپ ساری دنیا کے لئے رحمت ہیں نہ کہ کسی خاص مذہب کے لوگوں کے لئے۔

اسے صرف نام یا خطاب نہ سمجھئے بلکہ فی الحقیقت ان دو لفظوں میں اسلام کا اصل نظریہ پیش کیا گیا ہے یہی نہیں نبی کریم کو آگے چل کر "کافتہ للناس" کہا گیا ہے یعنی آپ ساری خلق کے لئے کافی و شافی ہیں۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کا مقصد تمام دنیا کے لئے لوگوں کی خدمت ہے یا یوں کہئے کہ تمام دنیا کی خدمت کرنے کا نام اسلام ہے۔ یہ نظریہ اور لائحہ عمل بھی یہی بتاتا ہے کہ آپ عالمگیر مصلح تھے۔

ایک مصلح عام کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ خلق میں یکسانیت پیدا کرے اور اس کو اجتماعی نقطۂ نظر سے دیکھے چنانچہ یہ نظریہ بھی نبی کریم نے ہمارے سامنے پیش کیا۔ اسلام کی تعلیمات مساوات آفتاب سے زیادہ روشن ہیں۔ اسلام ہماری، فتراکی تقسیموں اور ذات پات کو تسلیم نہیں کرتا۔

قرآن کریم کی مشہور آیتہ ہے:۔

وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

ہم نے تمہاری تفریق قبیلوں اور خاندانوں میں تشخص و تعارف کیلئے کی ہے مگر خدا کے نزدیک بزرگ وہی ہے جو متقی ہو۔

منہاج و شریعت کہا جاتا ہے اور جن کے حسن و قبح پر نوع انسانی کے تخریب و تعمیر کا انحصار ہے۔ یقین کوئی مذہب یہ نہیں سکھاتا کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کرنا چاہیئے مذہب ارضی ہے سماوی نہیں۔ انسانی ہے خدائی نہیں۔ وصفی ہے فطری نہیں۔ مذہب فقط تقاضا ہے کہ جو باتیں خود فطرتِ انسانی کے مقتضیات میں سے ہوں ان کا نگراں اور پاسبان ہو اور چونکہ مدنی زندگی خود فطرتِ انسانی کا اقتضا ہے اس لئے جو مذہب اپنے قوانین کو محض انفرادی زندگی تک ہی محدود رکھتا ہے وہ کبھی فطری نہیں کہلایا جا سکتا۔ اسی لئے کہا گیا ہے :۔

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ

لہٰذا یہ بات واضح ہو گئی کہ انسان انسان کیلئے پیدا ہوا ہے اور دنیا میں اس کا فرض ایک دوسرے کے ساتھ بھلائی کرنا اور ان کی مدد کرنا۔ اس خیال کو ایک اور شاعر یوں ظاہر کرتا ہے :۔

واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کیلئے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

جب یہ معلوم ہو گیا تو کسی مصلح عالم کی سچائی اور عظمت کی سب سے پہلی پہچان یہ ہونی چاہیئے کہ اس نے کہاں تک عالم انسانیت کی بہبود و نفع رسانی و خدمت کی تعلیم دی ہے۔ ہمارے نبی کریم ﷺ کی تعلیم روح رواں یہی اصول ہے۔ اسلام اس انسانی ہمدردی کے معاملہ میں مختلف جغرافیائی حدود کو بھی تسلیم نہیں کرتا۔ قرآن کریم میں بار بار اور اصرار کے ساتھ اس اصول کی تلقین کی گئی ہے۔ چنانچہ کہا گیا ہے :۔

افضل الناس من ینفع الناس } سب سے اچھا وہ شخص ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچائے

ایک حدیث ہے :۔

لیس المومن الذی لیشبع وجارہ } وہ شخص مومن نہیں جو خود شکم سیر ہو
جائع الی جنبہ ط } اور پہلو میں ہمسایہ بھوکا ہو۔

یہ ہی نہیں بلکہ اس تعلیم پر اس قدر زور دیا گیا ہے کہ حق العباد یعنی خدمت خلق کو حق اللہ یعنی خدمت خ

قرآن پاک کی یہی قابلِ عمل تعلیمات اس کی عظمت کا ثبوت ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی اس خوبی کو غیر قوموں کے پیشوا بھی تسلیم کرتے ہیں۔ مہاتما گاندھی کہتے ہیں میں نے قرآن کا مطالعہ کیا مجھے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ نظر آئی کہ وہ فطرت انسانی کے بالکل مطابق ہے۔ ٹیگور اس سے بھی آگے گئے ہیں اور وہ کہتے ہیں :۔ "وہ وقت دور نہیں جب کہ قرآن اپنی قابلِ تکمیل صداقت اور روحانیت کے ذریعہ سے دیگر مذاہب کو اپنے اندر جذب کر لیگا" سکھ مذہب کے گرو نانک دیو جی کا ارشاد ہے :۔ "توریت۔ انجیل اور وید سب پڑھے ہیں مگر قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو اس گمراہی کے زمانہ میں سب سے اعلیٰ اور رفیع ہدایت نامہ ثابت ہوئی ہے" ہر شلہ اسلام کا ایک جرمن نقاد کہتا ہے :۔ "کوئی چیز عربوں کو اتنی سرعت سے تہذیب کی طرف نہیں لیجا سکتی تھی جتنی کہ قرآن لے گیا۔

ایک مصلح عالم کا یہ بھی فرض ہے کہ عالم انسانیت کے جو طبقے دوسرے طبقوں کی زیادتی یا ظلم و ستم کی وجہ سے پستی میں گر رہے ہوں۔ انھیں ابھار کر سب کو ایک سطح پر لانے کی کوشش کرے۔ ہمارے نبی کی اصلاحات اسی اصول پر مبنی تھے میں یہاں پر صرف دو اصلاحوں کا ذکر کروں گا۔

پہلی اصلاح غلامی کی رسم کا انسداد ہے۔ اس زمانہ میں جب اسلام دنیا میں آیا ساری دنیا میں غلامی کی رسم جاری ہی نہیں تھی بلکہ غلامی جزو بدن، جزو خاندان اور جزو تمدن تھی اور غلامی کا قطعی انسداد ناممکن تھا۔ ہمارے نبی کریم نے مثل ایک حکیم حاذق کے حالت کی سچی نباضی کی اور اس مرض کو دور کرنے کی کوشش کی اور سب سے پہلے یہ کیا کہ غلاموں کو آزاد کرنا بہترین نیکیوں میں شمار کیا۔ قرآن پاک میں بار بار اس کی تاکید کی گئی ہے پھر جو غلام رہ گئے ان کے ساتھ بھی حسن سلوک کا حکم دیا۔ چنانچہ مشہور حدیث ہے :۔

المسلم و المسلمۃ اخ و اخت فالطارقکم الطارقہم فلبسوھم کما تلبسون و اطعموھم کما تطعمون	مسلمان مرد اور عورت بھائی اور بہن ہیں۔ انہیں بھی وہی کپڑا پہناؤ جو تم پہنتے ہو اور وہی کھلاؤ جو تم کھاتے ہو۔

اسی کے ساتھ اسلام نے عملی حیثیت سے وہ نمونہ بھی پیش کر دیا جس سے غلامی کی رسم دنیا سے معدوم ہو جائے۔ چنانچہ زیدؓ کی شادی حضرت زینبؓ سے کی گئی جو آنحضرتؐ کی قریبی عزیزہ تھیں اور بلالؓ کی

یاد رکھئے لفظ "اتقا" میں ایسی اخلاقی اور روحانی عظمت کا راز مضمر ہے۔ جس کا حج انسان نہیں ہو سکتا اس لئے اس بنا پر بھی کچھ کہنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریمؐ نے ایک دفعہ یہاں تک فرمایا:

لا تفضلونی علی ابن متیٰ ۔ حضرت فاطمہؓ کو بھی یہ تلقین کی گئی:

یا فاطمۃ لا تکتکی انک بنتی اعملی اعملی } اے فاطمہؓ اس پر بھروسہ نہ کرنا کہ میری بیٹی ہے بلکہ عمل خیر کرو۔

اسلام کے نزدیک سارا عالم انسانیت ایک کنبہ ایک برادری ہے اور ہر فرد ساری خلقت کے لئے باعث تقویت ہے۔ اقبال نے خوب کہا ہے:

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اسلام ہر قسم کی گروہ بندی کے قطعاً خلاف ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ } جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہ گروہ ہو گئے تم کو ان کی کسی چیز اور کسی بات سے سروکار نہیں۔

ایک مصلح عالم کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اگر وہ کوئی لائحہ عمل پیش کرے تو وہ ایسا نہ ہو کہ نصب العین ہو کر رہ جائے بلکہ وہ قابل عمل بھی ہو اور ساری دنیا کے لئے قابل عمل ہو۔ چنانچہ اسلام کے تمام اصولوں میں اس کا خاص انتظام ہے وہ محض خیالی نظریات نہیں پیش کرتا بلکہ قابل عمل دستور پیش کرتا ہے۔ قرآن کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جو انسان کے دائرۂ اختیار یا استعداد سے باہر ہو چنانچہ خود قرآن کہتا ہے لَا یُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ط (خدا طاقت کے موافق تکلیف دیتا ہے)

بہت ممکن ہے کہ آپ کو اکثر کتابوں میں ایسے نظریات ملیں جو پڑھتے وقت آپ کو بہت اچھے معلوم ہوں اور آپ تھوڑی دیر کے لئے ان کی خوشنمائی سے متاثر ہو جائیں اور ان کے مقابلہ میں آپ کو قرآنی تعلیمات ایسے نہ معلوم ہوں مگر جب عملی دنیا میں آپ دونوں اصولوں کو آزمائیں گے تو قرآن پاک ہی کے اصولوں کو سچا پائیں گے۔

لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ } یعنی وہ جیسا تمہارے ساتھ ہیں تم ان کے ساتھ رہو۔

اسی طرح جہاں گوتم بدھ نے یہ کہا ہے کہ "عورت ایک کھناؤنی چیز ہے اور اس سے الگ رہنا چاہیئے"۔ وہاں قرآن کہتا ہے:-

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ } یعنی وہ تمہارے لئے باعث زینت ہیں اور تم ان کے لئے۔

جہاں شیکسپیئر نے یہ کہا کہ عورت ایک نازک ترین شیطان ہے جسے کوئی نہیں سمجھ سکتا وہاں قرآن کہتا ہے:-

لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَن تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا } کسی عورت کی بغیر خاطری کے [illegible] جبر نہیں۔

اسی طرح جہاں منوسمرتی نے عورت کو شودر کے درجے سے بھی کم رکھا اور اس کو وراثت سے کوئی حق نہیں دیا۔ وہاں اسلام نے اسے نہ صرف ماں باپ سے حق دلایا بلکہ شوہر سے، بہن بھائی، بیٹا بیٹی سب سے حق دلوایا۔

پھر اسلام نے نکاح کو ایک معاہدہ قرار دیا۔ ہر معاہدہ میں معاہدے کے اعتبار سے دونوں فریقوں کی حیثیت برابر ہوتی ہے۔ نکاح میں مساوات کا بھی یہی مفہوم ہے۔ طلاق کا حق بھی دونوں کو دیا گیا اور برابر کا۔ میں خلع کے مسئلے سے واقف ہوں لیکن جو لوگ خلع کے قائل ہیں وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ جو معاہدہ تحریر میں آجاتا ہے اس میں مرد و عورت دونوں پر اس کی پابندی لازمی ہے۔ خواہ وہ طلاق ہی کے متعلق ہو مگر یاد رہے کہ وہ صرف دھوکہ کو روکنے کے لئے عمل میں آتی ہے۔ ایک سچے مسلمان کا اسلامی عمل یہ نہیں ہے کہ وہ دھوکہ دینے والا ہو۔ اسلام تحریر و تقریر میں کوئی فرق نہیں سمجھتا کیونکہ ہمارے مذہب کا سب سے بڑا اصول یہ ہے:-

الاعمال بالنیات } اعمال کا تعلق ارادوں سے ہے۔

ایک مصلح عالم کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا روزمرہ کی زندگی کا قانون ایسا ہو کہ وہ عام معاشرتی زندگی کو بلند کرے۔ معاشرت کے اصول ایسے ہوں کہ عالمگیر ہو سکیں اس کے اصول تمدن، معاشرتی و اقتصادیات سب ایسے ہوں کہ جن میں خلق سے کافی لگاؤ ہے اور انھیں کے بہبود پر مبنی ہوں۔ اسلام کی روزانہ کی

سادی قبیلۂ قریش میں لی گئی، عرب میں سب سے افضل و ممتاز قبیلہ تھا اسی طرح اور بھی شا
اسلام نے جو اسپرٹ پیدا کردی تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ خود ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے زما
صدہا غلاموں کے نام سے بھی حکومت کر چکا ہے جس کی حکومت کو مسلمانوں کے ہر فرقہ نے بلا لحا
و نقد ان تسلیم کیا تھا۔ اقبال نے ایک جگہ اسی اسلامی مساوات کا کیسا سچا نقشہ پیش کیا ہے ؎

آگیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز ۔۔۔ قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجا
ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز ۔۔۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نوا

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

دوسری اصلاح عورتوں کے متعلق ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جس وقت اسلام دنیا میں آیا ا
عورتیں دنیا میں بڑی بری حالت میں تھیں۔ اکثر ملکوں میں تو اس وقت لڑکی کا پیدا ہونا نہایت منحوس سمجھ
تھا اور کثرت سے لڑکیاں زندہ دفن کر دی جاتی تھیں یا اور بہت سے حیلوں سے انہیں ختم کر دیا جا
خود عرب میں یہی دستور تھا اور ہندوستان میں آج سے دو صدی پہلے تک جا بجا یہی رنگ تھا اور کسی
نے اس وقت تک عورتوں کو کوئی حق نہیں دیا تھا۔ اسلام نے سب سے پہلے عورتوں کی اس حالت
کے خلاف صدا بلند کی اور ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کیا کہ دنیا میں عورت و مرد دونوں کی یکساں ضرورت ہے
بغیر دونوں کے کسی کا وجود عمل میں نہیں آسکتا اس لئے یہ نام خیالی قدرت کی ناسپاسی ہے۔ قرآن کہتا ہے :-

وَيَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ الْإِنَاثَ وَ يَهَبُ لِمَنْ يَشَاءُ الذُّكُورَ } خدا جسے چاہتا ہے لڑکی بخشتا ہے۔ جسے چاہتا ہے لڑکا عطا فرماتا ہے۔

اسی طرح لڑکے لڑکی کی تفریق مٹا دی، مردوں کے تمدن نے چونکہ عورتوں کو ضعیف البنیان سمجھا تھا اس لئے عورتوں کی حفاظت مردوں کے متعلق کر دی اور کہا :-

الرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِ } مرد عورتوں کے نگہبان ہیں۔

مگر اسی کے ساتھ ان کو ایسے حقوق دئے کہ ان کو اسی مرتبہ پر پہنچا دیا جس پر مرد تھے چنانچہ ارشاد ہے :-

پہلے ہی سے دیکھ لیا تھا اور جو اصول اس نے [illegible] [illegible] نسبت [illegible] ہے

اپنا [illegible] کو [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] معاشرت

[illegible] [illegible] وات [illegible] [illegible] دیا کہ جس کی نظیر [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہیں جو

اصول مقرر کیے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] نہیں ہو سکتا

چنانچہ قرآن کہتا ہے :-

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا ـــ وَاللَّهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَادِّي رِزْقِهِمْ عَلَىٰ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَاءٌ أَفَبِنِعْمَةِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ ۝

[illegible] [illegible] معیشت [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] فوقیت دی ہے [illegible] اور اللہ تعالیٰ نے تم [illegible] بعض [illegible] کو بعض لوگوں پر رزق سے فضیلت دی ہے۔

اس لیے وہ ہر انسان کی روزی کا کوئی [illegible] [illegible] نہیں کرتا بلکہ [illegible] اس کی استعداد و صلاحیت پر چھوڑتا ہے۔ اسلام کے انتقال جائداد و وراثت کے قوانین اور [illegible] [illegible] ہیں جن سے انسانی فلاح و بہبود بہ حیثیت مجموعی ترقی کریں [illegible] اسلام [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] قابل قدر حقیقت ہے کہ اگر اسے صحیح اصول پر چلایا جائے تو ہمارے قومی کاموں [illegible] [illegible] [illegible] نہیں [illegible] [illegible] [illegible] بلکہ جمعیت اوقاف کی حالت غالی ہو جائے اور اس کے احکام پر عمل کیا جائے تو ہماری قوم میں [illegible] [illegible] [illegible] سکتی ہے۔ اسلام کا آئینی اصول بھی [illegible] پڑھتی ہے جو خود [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہے جس نے جمہوری آئین کو رواج دیا۔

غرضکہ جس پہلو سے دیکھا جائے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] مسلم [illegible] تھے بلکہ [illegible] [illegible] تمام مصلحوں میں [illegible] گئے تھے۔

زندگی کے جس اصول پر نظر ڈالئے گا یہ معلوم ہوگا کہ کسی مذہب نے معیار زندگی کو بلند کرنے کی اتنی کوشش نہیں کی
اسلام نے مثال کے طور پر یہاں صرف دو چیزیں پیش کی جاتی ہیں یعنی معاہدات اور امانت اور دیانتداری
کے متعلق اسلام کا تخیل اور اس کی تعلیم۔ قرآن کہتا ہے اُوْفُوْا بِعَهْدِیْ کُمْ اور مختلف جگہ مختلف عنوان سے ا
کی تاکید کرتا ہے۔ مگر میں یہاں صرف اسی ایک آیتہ پر اکتفا کرتا ہوں۔ اس کی نوادر بھی مثالیں مل سکتی ہیں کہ ج
اقوام کے ساتھ عہد و پیمان ہوا انھوں نے اس عہد و پیمان کی بنا پر عموماً عدل و انصاف کیا لیکن اسلام اس سے
ایک قدم اور بڑھاتا ہے اور وہاں پہنچتا ہے جہاں ہم سے سب سے ممتاز دیکھتے ہیں یعنی اسلام کا عام حکم ہے
لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا تمہیں کسی قوم کی عداوت ناانصافی پر آمادہ نہ کرے۔
یعنی جو قومیں مسلمانوں سے برسرپیکار ہوں۔ جب ان سے معاملہ پڑے تو رشتۂ عدل و انصاف ہاتھ سے نہ جانے
اب امانت کو دیکھئے، امانتداری اور دیانتداری زمانۂ حال کے تمدن کی تمام ترقیوں کے باوجود ابھی تک محض
حکمت عملی کے درجے میں ہے لیکن نبی کریم کی تعلیم میں یہ جزو ایمان ہے چنانچہ سورۂ بقر کے تیسویں رکوع میں کہا گیا ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَی الْحُکَّامِ لِتَاْکُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ط

اے ایماندارو! تم اس مال کو جو تمھارے پاس امانت کے طور پر ہے۔ فریب کے ساتھ نہ کھاؤ۔ الخ

اس آیتہ میں یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ جو لوگ دوسروں کا مال غصب کر کے اپنی حیثیت زمہ
حکام رسی کرتے ہیں اسلام نے ان کی خاص طور پر مذمت کی ہے پھر سورۂ النساء کے پانچویں رکوع میں اور دیگر مختلف
آیات میں بالفاظ مختلف اس حکم کی تکرار کی گئی اور اسی سورہ کے آٹھویں رکوع میں امانتداری سے انحراف کی تعذیر
ہے اور امانتداری اتنی ضروری چیز سمجھی گئی کہ قبل بعثت آپ کو مجتبیٰ امانت بنا دیا گیا۔ یہاں تک کہ دوست دشمن
آپکو امین کے نام سے پکارنے لگے۔ آپ کی یہی صفت تھی جس نے حضرت خدیجہؓ کو آپ کا گرویدہ بنا دیا اور نکاح
کے لئے مائل کیا۔ کاش ہم اس نکتہ کو سمجھتے اور اس نظریہ کو مدنظر رکھ کر اس دنیا میں قدم اٹھاتے۔ غرض کہ ان تمام باتوں
کے لحاظ سے بھی اسلام تمام مذہبوں سے فوق فوق ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تمدن نے تمام آئندہ والی وقتوں کو

تم مجھ سے معجزات اور کرامات کی فرمائش کرتے ہو۔ میں نے تو اپنی ساری زندگی تمہارے ہی درمیان بسر کی ہے۔ کیا یہ کافی نہیں۔ اُسے دیکھو اور امتحان کرو کیا میں نے کبھی جھوٹ بولا۔ کبھی دھوکا دیا یا کبھی بے ایمانی کی۔ اگر نہیں تو پھر اب کیوں تم مجھے جھوٹا سمجھتے ہو اور معجزہ و کرامات مانگتے ہو۔

یہ تھا وہ اسوۂ حسنہ جو آپ نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ معجزات کی جگہ اپنی زندگی کی [illegible] کی جگہ سچائی کی عظمت کو ظاہر کیا۔ لیکن ہم ہیں کہ اس زندگی سے بے خبر ہیں اور اس پیامبر [illegible] سے بے پروا۔ صرف کرامت اور معجزات کی تلاش ہے۔ اور اس کی زحمت نہیں گوارا کی جاتی کہ اُن کی تعلیم ہیں اور اُن کے پیام میں اپنے لئے ہدایت کی جستجو کریں۔ مانا کہ جتنے معجزات اور کرامتیں ہمارے [illegible] منسوب کی جاتی ہیں وہ سب صحیح ہیں تو ذرا معجزات و کرامات کے دلدادہ اصحاب ہمیں بتائیں کہ ان سے ہمیں کیا حاصل ہوتا ہے۔ ہم ان پر قادر نہیں ہیں اس لئے ہمارے لئے یہ مثال نہیں بن سکتے اور ان کے عدم یا وجود سے ہمارے جسم یا روح کو کوئی نفع یا نقصان پہنچ سکتا ہے؟ ہمارے لئے جو چیز مفید ہے وہ آنحضرت ﷺ کا پیام اور آپ کی زندگی ہے۔ پیام وہی ہے جس کے لئے آپ نے اپنے آپ کو ایلچی کہا یعنی خدا کا کلام اور زندگی اس کلام کی عملی تشکیل ہے جسے اسوۂ حسنہ کہا گیا ہے۔

ہمارا سب سے بڑا اور پہلا فرض یہ ہے کہ ہم قرآن کو پڑھیں اور اسے سمجھیں۔ قرآن مسلمانوں کے لئے ایک کتاب ہدایت اور مذہبی اور تمدنی قانون ہے۔ وہ اس لئے آیا ہے کہ ہم اُسے سمجھیں اور [illegible] پر عمل کریں۔ نہ اس لئے کہ اُسے جزدان میں بند کر کے رکھ دیں مگر افسوس ہے کہ آج قرآن کو سمجھنے کی غرض سے پڑھنے والے مسلمان نہیں نظر آتے۔ اس وقت تو یہ صورت ہے کہ خاشعاً متصدعاً کی جگہ ہمارے قرآن کو [illegible] مُردوں میں پڑھ دیا جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ قرأت ہو گئی۔ قرآن میں قصص ہیں۔ قوانین ہیں۔ پیام ہیں۔ دعائیں ہیں۔ عذاب و ثواب کی سورتیں ہیں۔ مگر یہ سب کچھ ایک ہی لب و لہجہ سے پڑھی جاتی ہیں اور داد طلب کیجاتی ہے۔ ذرا بھی موقع محل کا لحاظ نہیں کیا جاتا ذرا غور کیجئے کہ اگر کوئی حکومت یہ قانون بنا دے کہ زانیوں کو سزائے تازیانہ دی جائے گی اور ہم اس قانون کو سمجھتے اور اس سے واقف رہتے کے بجائے [illegible] کے الفاظ کو تال اور سُر کے ساتھ دہرائیں یا ڈھولک کی تھاپ پر گائیں تو کیا یہ مضحکہ خیز بات نہ ہوگی لیکن

اُسوۂ حسنہ

جماعتِ رسولِ کریم صلے اللہ علیہ وسلم کو مختلف جماعتیں مختلف نظر سے دیکھتی ہیں۔ کوئی افراط کی حد تک گئی تو کہہ دیا کہ احمدؐ کو بے سیم کے دیکھو۔ کسی نے کہا کہ آپ کو دیکھنا ہو تو اُن واقعات میں دیکھو جو آپ کی پیدائش کے وقت ظہور میں آئے اور ان واقعات کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ حضرت آمنہؓ کو دردِ زہ ہوئے اور قیصر کے محلوں میں کنگرے گر پڑے۔ لات و عزیٰ میں جان پڑ گئی اور وہ سنگوں ہو گئے کسی نے آپ کو نورِ مجسم قرار دے دیا اور آپ کے جسدِ خاکی کو صرف آنکھوں کا تصور بتایا اور دلیل پیش کی کہ جب آپ چلتے تو زمین پر آپ کا سایہ نہ پڑتا کسی نے آپ کی گفتگو شجر و حجر سے سنانی شروع کر دی اور ان مخلوق کو بھی حیوان ناطق بنا دیا۔ غرضیکہ بھانت بھانت کی بولیاں سنائی پڑتی ہیں مگر جب خدا کی طرف رجوع کیا جاتا ہے تو قرآن کریم میں نبی کی زبان سے یہ اعلان کرایا جاتا ہے کہ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یوحیٰ اِلَیَّ ط جس کی تفسیر حالی نے یوں کی ہے :-

نہیں بندہ ہونے میں کچھ مجھ سے کم تم ۔۔۔ کہ بیچارگی میں برابر ہیں ہم تم
مجھے دی ہے حق نے بس اتنی بزرگی ۔۔۔ کہ بندہ بھی ہوں اُس کا اور ایلچی بھی

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کبھی اس کا اعلان کیا کہ آپ صاحبِ معجزہ ہیں۔ نہ کرامات سے لوگوں کو مرعوب کرنے کی کوشش کی بلکہ جب عرب کے لوگوں نے آپ سے فرمائش کی کہ اگر آپ نبی ہیں تو یہ معجزے یا کرامات دکھائیے اس وقت آپ نے قرآن کریم کے الفاظ میں یہ جواب دیا کہ :-

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ط

نبی کریم دنیوی طمع سے مبرا تھے

(*)

جبکہ یورپ اور سارے ایشیا کی فضا ہر اعتبار سے نہایت ہی تاریک تھی۔ دوربین نگاہوں کو افق مکہ پر ایک ایسے عظیم الشان ستارے کی نمود نظر آئی جسکے نورانی پیکر میں تمام دنیا کی روشنی سمٹی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یہ عظیم الشان ستارہ رسول عالم محمد عربی صلعم کا مقدس وجود تھا۔ آپکی اسلامی تعلیمات سے پہلے ہی لوگ آپکی انسانی صفات کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ لوگوں کے لئے آپ کی روزمرہ کی زندگی ایک مثالی زندگی تھی۔ سب سے پہلی صفت جس نے لوگوں کو آپ کا گرویدہ کیا یہ تھی کہ بچپن ہی سے آپ نے ایک بار بھی جھوٹ نہ بولا تھا اور کوئی کام ایسا نہ کیا تھا جس سے آپ اپنے ہمسایہ یا دوسرے لوگوں کا اعتماد کھو دیتے چنانچہ نبی ہونے سے بہت پہلے ہی آپ امین کے نام سے مشہور ہو چکے تھے۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ اس زمانہ میں بنکوں کا رواج نہ تھا۔ جہاں لوگ اپنے روپیہ یا اپنی املاک کو امانت کے طور پر جمع کرتے۔ اس لئے لوگ اپنی امانت دوسروں کے پاس رکھانے میں بڑی احتیاط کرتے تھے۔ لیکن آپ کے پاس بلا خوف و خطر لوگ اپنی امانت رکھ جاتے تھے۔ آپ کی زندگی کا یہی پہلو تھا جس سے متاثر ہو کر اس زمانہ میں عرب کی سب سے بڑی دولتمند خاتون حضرت خدیجہ رضؓ نے آپ سے نکاح پڑھوایا۔ آپ کی زندگی کا ایک اور واقعہ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ بحیثیت ایک انسان کے دنیاوی طمع اور لالچ سے کس قدر بری تھے۔ اور آپ کی روزمرہ کی زندگی میں صداقت کا معیار کس قدر بلند تھا۔ خود آپ کے قبیلہ قریش کے لوگوں نے آپ کو طرح طرح کے لالچ دیے۔ کیونکہ آپ کی تعلیمات کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں انکا وقار کم ہوتا جاتا تھا متعدد بار انھوں نے اپنے نمائندوں

قرآن کے ساتھ ہم روز یہی مضحکہ کرتے ہیں [illegible] ہوتا مثلاً "الزانیۃ والزانی فاجلدوا کل واحد منہما مائۃ جلدۃ" کی آیت میں زنا کی سزا بیان کی گئی ہے مگر نا سمجھ ملا اُسے حافظ کی غزل کی طرح ترنم کے ساتھ پڑھتا ہے۔

ستم پر ستم یہ کہ آج ہم نے خود تلاوت کے معنی بدل دیے۔ تلاوت کے معنی تقلید اور نقش قدم کے ہیں۔ لیکن قرآن کی تلاوت کا فرض ہم اس طرح ادا کرتے ہیں کہ بے سمجھے بوجھے محض متن کے الفاظ دہرا کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جب اس چیز کو نہ سمجھا جائے جس پر دار اسلام ہے تو اسلام کہاں رہیگا قرآن کو سمجھے بغیر ہمیں خدا کے احکام اور قرآنی تعلیمات کا کیونکر علم ہوگا اور پھر اس علم کے بغیر ہم محمد صلعم کے مبعوث ہونے کا مقصد کیونکر سمجھ سکیں گے اور ایسی حالت میں اگر ہمارے موجودہ مذہبی اعمال سے ہماری حالت میں کوئی اصلاح نہ ہو تو کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ ایسے مسلمانوں کے بارے میں قرآن پاک میں یہ کہا گیا ہے کہ قیامت کے دن نبی کریم سے پوچھا جائیگا کہ تمہارے پیروؤں کی ایسی زبوں حالت کیوں ہے تو آپ فرمائینگے کہ "یا رب ان قوم اتخذوا ھذا القرآن مھجورا" اے میرے پروردگار میری قوم نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے۔ یہ نہیں فرمائینگے کہ انھوں نے سلامت شاہ کو چھوڑ دیا یا امام سلیم کی تقلید نہیں کی یا شبینے نہیں پڑھے یا مولویوں کی دعوتیں نہیں کیں یا پیر زادوں کی [illegible] پر چڑھاوے نہیں چڑھائے اور سجدے نہیں کئے۔

غرضیکہ ہمارا اولین فرض یہ ہے کہ ہم قرآن کو سمجھیں [illegible] سورۂ حسنہ یعنی نبی کریم کی زندگی کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھیں۔ نبی کریم کی زندگی کا لب لباب صرف دو لفظوں میں ہے یعنی رحمۃ للعالمین۔ یہی دو الفاظ اگر کوئی شخص اپنا مطمح نظر اور مقصد زندگی بنائے تو وہ زندگی کا بہترین نمونہ پیش کر سکتا ہے اور آج سیاسیات عالم میں اگر یہ دو لفظ کارفرما ہو جائیں تو دنیا کا انتشار رفع ہو جائے۔ نفسا نفسی اور کشاکش دور ہو جائیں اور [illegible] عالم کا جو مقصد بڑی بڑی کانفرنسوں سے نہیں ہو سکا ہے وہ آن واحد میں حاصل ہو جائے۔ اسلئے کہ ہر فرد اور ہر قوم اپنی خلقت کا راز سمجھ کر ایک دوسرے کی بیخکنی کرنے کے بجائے یہ کہکر ایک دوسرے سے بغلگیر ہو جائے کہ ؎

من تو شدم تو من شدی۔ من تن شدم تو جاں شدی

یہی اسلام کا وہ مقصد اعلیٰ اور نبی کریم کا نمونہ تھا جسے دیکھکر ایک شاعر مست ہو کر گانے لگا تھا کہ ؎

آفاقہا گردیدہ ام [illegible] بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

جس سے آپکی روزمرہ کی زندگی کی عظمت پر روشنی پڑتی ہے یہ ہے کہ جب عمرو بن عاص نے شاہ نجاشی والیٔ حبش سے کہا کہ جن مہاجرین نے اس کے ملک میں پناہ لی ہے انھیں ملک سے نکال دے تو اس نے نبی کریمؐ کی زندگی کے حالات دریافت کئے۔ آخر میں اُسنے اقرار کیا کہ بیشک آپکی زندگی بیداغ مکمل اور قابل تقلید ہے۔ آپکی زندگی کے متعلق ایسا ہی عمدہ خیال آپکے ایک دوسرے دشمن ابوسفیان نے بھی ظاہر کیا جس نے ہرقل شاہ روم سے آپ کے خلاف مدد طلب کی تھی۔ جب نبی کریمؐ نے مکہ اور طائف کو فتح کیا جو آپ کے مخالفین کا مرکز تھا اور اہل شہر آپ کے پاس اس غرض سے لائے گئے کہ ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جائے جو از روئے قانون جنگ جائز تھا تو آپ نے سب کو معاف کر دیا۔ بسبیل تذکرہ یہ بھی سُن لیجئے کہ اس زمانہ میں اہل مکہ سے جو عہدنامہ آپ نے کیا تھا وہ ایک مثالی عہدنامہ سمجھا جاتا ہے۔ آپ نے تمام اہل مکہ کو شہری حقوق عطا فرمائے۔ اس عہدنامہ کے بعد کا واقعہ ہے کہ ایک بڈھا مسلمان آپ کے خیمہ میں آیا اور اہل مکہ کے ظلم و تعدی کی شکایت کر کے اس نے خواہش ظاہر کی کہ اُسے روک لیا جائے مگر چونکہ عہدنامہ کے مطابق مکہ والوں کی طرف سے اگر کوئی آئے تو اُسے واپس کرنا ضروری تھا۔ آپ نے حکم دیا کہ اس مسلمان کو واپس کیا جائے اور فرمایا کہ انفرادی شکایات ایفائے عہد کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتے غور کیجئے کہ عہدناموں کو ردی کاغذ کے ٹکڑے نہیں سمجھتے تھے بلکہ انھیں صداقت اور حرمت سے معمور ایک مقدس چیز سمجھتے تھے۔ آپ دوسرے مذاہب کو بھی عزت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور قرآن کریم کی اس تعلیم پر عمل کرتے تھے۔ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ ط (تمھارے لئے تمھارا مذہب اور ہمارے لئے ہمارا)

ایک واقعہ ایسا ہوا کہ ایک آدمی آپ کے پاس انجیل لایا۔ آپ نے از راہ ادب تعظیم اُسے اپنے تکیہ پر رکھا۔ اس سلسلہ میں یہ واقعہ بھی ہے کہ ایک دفعہ نجران کے عیسائیوں کا ایک وفد آپ کی خدمت میں حاضر تھا اور اُن کی نماز کا وقت آگیا۔ آپ نے مسجد میں انھیں اپنی نماز پڑھنے کی اجازت دی۔ اسی طرح فوجی سرداروں کو آپ کا یہ مستقل حکم رہتا تھا کہ وہ دوسروں کے مذہب کی توہین نہ کریں۔ آپ کا معمول تھا کہ اپنے ہمسایوں کے حال سے واقف ہونے کے لئے گھر گھر تشریف لیجاتے تھے۔ ان کے غم میں شریک ہوتے اور ان کی دستگیری فرماتے اس لحاظ سے آپ جو تلقین فرماتے اس پر خود بھی عمل فرماتے۔ اس موضوع پر آپ کے بعض اقوال

کو آپ کے پاس بھیجا اور اپنے قبیلے کی سرداری مکہ کی حکومت عرب کی امیر سے امیر لڑکی کے ساتھ شا
اور اسی طرح کے بیسیوں لالچ دلائے مگر نبی کریم نے ان سب سے یکلخت انکار کر دیا اور صاف کہہ
آپ دنیا کی بڑی سے بڑی چیز کی خاطر بھی اپنے پیام کی تبلیغ سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اس
میں یہ عام قاعدہ تھا اور مجھے اندیشہ ہے کہ اب تک ہے کہ خداوند کریم کی طرف سے مبعوث کئے ہوئے
کیلئے خرقِ عادات کا ہونا ضروری ہے اس لئے لوگوں نے آپ سے کہا کہ اگر تم برحق نبی ہو تو معجزہ
دکھاؤ۔ جس پر نبی کریم نے فرمایا انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الیّ میں تو تمہاری ہی طرح ایک انسان
ہوں۔ اگر تم میں اور مجھ میں کچھ فرق ہے تو صرف اتنا کہ میں تمہارے پاس خدا کا پیام لایا ہوں۔ آپ نے
بھی فرمایا کہ وہ لوگ آپ کے متعلق معجزات اور خرق عادات کی بجائے آپ کی روزمرہ کی زندگی کا جائزہ لے
رائے قائم کریں۔ قد لبثت فیکم عمرًا الخ میں تو تم ہی میں رہا ہوں، پلا ہوں۔ تم میری زندگی
سے میرے پیام کی صداقت کے کیوں قائل نہیں ہوتے۔ اس ضمن میں یہ بیان کرنا نامناسب نہ ہوگا
جس دن آپ کے لڑکے ابراہیمؓ کا انتقال ہوا اسی دن اتفاق سے سورج گرہن واقع ہوا۔ اس واقعہ
سے لوگوں کو یقین ہوا کہ آپ خدا کے نبی ہیں اور انھوں نے سمجھا کہ آپ کے لڑکے کی وفات پر غیر ذی روح
اشیاء بھی متاثر ہیں۔ یہ دیکھ کر لوگ آپ کے پاس آئے اور آپ کی نبوت پر ایمان لائے۔ آپ نے
دیکھ کر کہا کہ اگر تم لوگ اس واقعہ سے متاثر ہو کر میرے پاس آئے ہو تو یاد رکھو کہ اس واقعہ کا میرے لڑکے
کی موت سے کوئی تعلق نہیں اور ایسی حالت میں تم مسلمان نہیں ہو سکتے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ نبی کریم کی ذات
کتنی اعلیٰ ترذات تھی۔ نیز سچائی کا کتنا بلند معیار آپ کے پیش نظر تھا۔ ذرا سے نفسیات ماننا پڑتا ہے
کہ آپ کی زندگی میں اگر کوئی خامی ہوتی تو آپ کو اپنے مذہب کی تلقین میں ہرگز کامیابی نصیب نہ ہوتی
آپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے واقف ہونے کے لئے بعض اور واقعات پیش کئے
جاتے ہیں۔ مدینہ کے یہودی ہمیشہ آپ کے خلاف سازش کرتے رہتے تھے کیونکہ اسلام کی اقتصادیات
سے ان کے مالیات پر ضرب کاری لگتی تھی۔ اس کے باوجود آپ اپنے مقدمات میں یہاں تک کہ یہودیوں
اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی صورت میں بھی آپ ہی کو ثالث قرار دیتے۔ ایک اور تاریخی واقعہ

زندہ جاوید معجزہ

حق و باطل کی تمیز کا مسئلہ فی الحقیقت ایک ایسا "پل صراط" ہے جو تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ دنیا میں جو شخص کوئی دعوے پیش کرتا ہے اس کی پیشانی پر لکھا نہیں ہوتا کہ یہ سچ کہتا ہے یا جھوٹ۔ اس کے پرکھنے کا معیار تو لامحالہ بلند ہونا چاہیے۔ پھر دعووں کی نوعیت میں بھی فرق ہے۔ عام دنیاوی معاملات سے متعلق دعاوی بھی اپنے اندر خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن اس دعوے کی اہمیت پر ذرا غور فرمائیے۔ جو حضرات مامورین من اللہ کی طرف سے دنیا کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ یعنی ان کا دعوے یہ ہوتا ہے کہ جو پیغام یہ دنیا کو دے رہے ہیں اس کا سرچشمہ کوئی دنیاوی قوت نہیں بلکہ وہ اس قادر مطلق کی طرف سے ہے جسے خالق ارض و سما کہتے ہیں۔ پھر اس دعوے کا انکار بھی کسی معمولی پاداش کا مستوجب نہیں ہوتا بلکہ اس کا لازمی نتیجہ خسر الدنیا والآخرۃ اس زندگی اور آنے والی زندگی ہر دو کی ذلت و رسوائی کا موجب ہوتا ہے۔ اب اس مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور فرمائیے تو صاف نظر آجائے گا کہ معاملہ کس قدر پیچیدہ اور مشکل بلکہ نازک اور اہم ہو گیا۔ پہچاننا ضروری بھی اور مشکل بھی لیکن انسان کو اس ظلمت کدہ عالم میں بے بصری کی حالت میں نہیں چھوڑ دیا گیا کہ وہ تاریکی میں بھٹکتا رہے۔ پہچاننے کے اسباب ایسے مہیا کر دیے گئے کہ بظاہر ایسا مشکل معاملہ آسان ترین صورت میں حل ہو جائے۔

دنیا کے وجود کے ساتھ ساتھ انبیا کی بعثت ثابت ہے۔ ابتدائی زمانہ عالم انسانیت کا وہ تھا جب ذہن ہر غیر معمولی چیز سے متاثر ہوتا تھا۔ اسی سے بہت سی غیر معمولی مخلوقات کو خدا

ضرب المثل ہو گئے ہیں مثلاً واللہ لا یومن من یتسبع جارہ بخائع لوجہ۔ (۲) وا
لا یومن واللہ لا یومن واللہ لا یومن قیل من یا رسول اللہ قال من لا یامن جارہ
آپ کو اپنے دشمنوں سے بغض نہ تھا مثلاً آپ کا دشمن ابوبن ریب فوت ہوا تو آپ نے اپنا
اس کے کفن کے لئے نذر کر دیا۔ ایک ملاذم[1] سے جو آپ کے پاس دس برس تک رہا تھا۔ روایت ہے کہ آ
کبھی اس کے لئے کوئی سخت لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس وقت میں جب آپ عرب کے سب سے
سردار اور اسلام کے آفتاب تھے بعض وحشی آپ سے ملنے آتے اور آپ ہی کے حجرے میں قیام کر
وہ چلے جاتے تو آپ خود حجرہ صاف کرتے۔ حالانکہ آپ کے ہزاروں معتقدین اس کام کے لئے دوڑ
ہر شخص جانتا ہے کہ انتقال کے وقت آپ نہ صرف ایک بڑے مذہب کے۔ روحانی پیشوا تھے بلکہ ایک سلطنت
کے مالک تھے۔ اگر آپ چاہتے تو نمود و نمائش اور شوکت و امارت سے رہ سکتے تھے اور بیشمار دولت
جمع کر لیتے مگر تاریخ شاہد ہے کہ آپ کے انتقال پر آپ کی ڈھال چند سیر جو کے عوض رہن رکھنی پڑی
بیت المال کا ایک حبہ بھی آپ نے اپنی ذات پر صرف نہ کیا۔ اس کے برعکس آپ اپنا پیٹ پالنے کے
مزدوری کرتے تھے۔ کاش دنیائے جدید آپ کی زندگی کے واقعات سے سبق حاصل کرے۔ اور بے
اور مشکلات سے بھری ہوئی اس دنیا کے مالی نظام میں توازن اور تناسب قائم کرے۔ اس میں ذرا شک
نہیں کہ آپ ایک زبردست اہل سیف، ایک زبردست مدبر، ایک زبردست مصلح تھے۔ مگر ان
سے بڑھ کر آپ ایک زبردست انسان تھے۔

---

[1] حضرت انس رضی اللہ عنہ۔

کو شق کر دیا ، اور پتھر کو نطق بخشا، جانوروں سے گفتگو کی ، مردوں کو زندہ کیا جبکہ یہ کہا کہ ہم سب لڑتے ، جھگڑتے تھے فواحش ولغویات اور عیش وعشرت میں مبتلا تھے۔ جھوٹ بولتے تھے اور زناکاری کرتے تھے ، دنیا کے سارے معائب کو اپنے اوپر معاف سمجھتے تھے۔ ہمارا [illegible] ہے جس نے ان تمام معائب سے ہم کو بچایا۔ نیکی اور پرہیزگاری کی طرف ہم کو مائل کیا خلق اللہ کی خدمت کا ہم کو سبق دیا۔ اور ہمارے نبی وہ ہیں جو تمام نیکیوں تمام خوبیوں ، تمام [illegible] اور تمام ایمانداریوں کے مشکل اعظم ہیں۔" شاہ نجاشی حبش نے کہا" جاؤ! امن سے رہو ہمارے ملک میں تمھیں کوئی تکلیف نہیں دے سکتا" اور وفد مکہ سے کہا کہ "اے اہل مکہ ہم ایسے لوگوں کو جن کے یہ اصول زندگی ہوں تمھارے سپرد نہیں کر سکتے۔"

اس سے ظاہر ہو گیا کہ حسن دین فی الحقیقت حسن زندگی ہے اور حسن زندگی نبی کریم کی زندگی ہے۔ اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

بہ مصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی ست!

تک سمجھا گیا اور جو چیزیں آج واقعہ اتفاقیہ کے تحت میں آتی ہیں وہ خرق عادات اور معجز
تک بن گئیں۔ مگر امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ارتقائے انسانی بڑھتا گیا اور لوگ چیزوں کے پرکھ
میں عقل و ہوش سے کام لینے لگے۔ جب نبی کریم دنیا میں مبعوث ہوئے تو اس ational
زمانے کی ابتدا ہو چکی تھی اس لئے آپ کی نبوت کے پرکھنے والوں میں جہاں کچھ توہمات کے دلدا
بھی تھے وہاں وہ لوگ بھی تھے جو عقل و دلیل سے اس کی صداقت کا ثبوت چاہتے تھے۔ یہ بات
تھی۔ نبی کریم نے جو پیام سنایا اس کے لئے یہ اعلان کر دیا کہ یہ پیام تمام ممالک اور تمام زمانے کے
ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ یہ ایسا پیام ہوا کہ ارتقائے انسانی کے تمام مدارج طے ہونے کے بعد
بھی وہ عالم انسانیت پر حاوی رہیگا اور اس کیلئے کامل نظام بنا رہے گا۔ قرآن نے کھلم کھلا
دعوے کیا ہے " الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی

یہی وجوہ ہے ہمارے نبیؐ نے اپنی صداقت کے ثبوت میں یہ نہیں کہا کہ لو ہم یہ معجزہ دکھاتے ہیں
کسی اور سے کہو کہ ایسا معجزہ دکھائے بلکہ یہ کہا کہ دیکھو ہم یہ قرآن اپنے ساتھ لائے ہیں تم کوئی دوسرا
اس کے مثل یا اس کے کسی ٹکڑہ کے مثل کوئی ادبی معجزہ یا روحانی معلم پیش کرو۔
کیا ہے کوئی کتاب جو اس سے بہتر دستور معاشی اور اس سے بہتر روحانی معلم بن سکے۔
اور جب معجزات پر اصرار ہونے لگے تو آپ نے فرمایا کہ " تم مجھ سے معجزات مانگتے ہو "
میں نے تو تم میں اپنی ساری عمر بسر کی پھر میری زندگی کیوں نہیں دیکھتے۔

قد لبثت فیکم عمرا الخ

تاریخ کا یہ واقعہ بڑا سبق آموز ہے کہ حضرت جعفر طیارؓ مع دیگر مسلمانوں کے اہل مکہ کے
مظالم سے تنگ آکر حبش میں ہجرت کر گئے تھے۔ مکہ والوں کا ایک وفد بادشاہ حبش کے پاس پہنچا
ان لوگوں کو واپس کر دیا جائے۔ بادشاہ نے حضرت جعفر طیارؓ کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ بھی
تمھارا کون سا مذہب ہے جس کی وجہ سے تمھارے سب دشمن ہو رہے ہیں اور تمھارا کون نبی ہے
اور اس کی خصوصیات کیا ہیں۔ اس کے جواب میں آپ نے یہ نہیں کہا کہ ہمارے نبی وہ ہیں جنھوں نے تم

انہ لقرآن کریم فی کتاب مکنون لا یمسہ الا المطہرون تنزیل من رب العالمین ط (الواقعہ)

اسی طرح کی اور متعدد روایات ہیں جن سے تلاوت کرنے والے حضرات واقف ہیں۔ یہ بھی دیکھئے کہ اپنی احادیث کو رسول اللہ نے کلام اللہ نہیں فرمایا اگر دونوں ایک ہی چیز ہوتے تو اس کی تفریق کی ضرورت نہ تھی یہی نہیں بلکہ قرآن کو انا لہ لحافظون کہہ کر محفوظ کیا، اور احادیث کے لئے حفاظت کا وعدہ تو درکنار اس کے جمع کرنے کی بھی حوصلہ افزائی نہیں کی

دوسری چیز قابل غور یہ ہے کہ قرآن پاک کا زمانہ نزول انیس سال ہے اور اتنے زمانہ میں انسانی زندگی کے اندر طرح طرح کے انقلابات رونما ہوتے ہیں مختلف جذبات نشو ونما پاتے ہیں۔ مختلف ماحول کے تاثرات اس پر پڑتے ہیں لہذا کوئی چیز جس میں انسان کا ہاتھ لگا ہو ان تغیرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی ایک مصنف کی اوائل عمر کی تصنیف اور آخر عمر کی تصنیف میں زمین آسمان کا فرق ہو جاتا ہے لیکن قرآن پاک ان تغیرات اور اختلافات سے مبرا ہے اور شروع سے آخر تک ایک ہی انداز بیان میں ہے اور اس کی تمام آیات ایک ہی اصول پر مبنی ہیں، نہ کہیں ایزاد ہے اور نہ تخالف۔ نہ افراط ہے نہ تفریط، نہ تناسخ نہ منسوخ، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

افلا یتدبرون القرآن ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیرا (النساء)

ایک اور آیت جس کے ذریعے سے قرآن پاک نے اپنے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت دیا ہے وہ یہ ہے فاتوا بسورۃ من مثلہ، عام طور پر اس کے وہی معنی سمجھے جاتے ہیں کہ ادبی لحاظ سے قرآن پاک کی نظیر کوئی اور کتاب نہیں ہے بے شک یہ صحیح ہے لیکن فی الحقیقت اس میں جس چیز کی طرف اشارہ ہے وہ قرآنی تعلیمات ہیں۔ اس آیت میں یہ دعوے کیا گیا ہے کہ اس سے بہتر اور اکمل انسانی زندگی کا دستور العمل کہیں اور نہیں مل سکتا۔ چنانچہ ایک

قرآن منزّل من اللہ ہے؟

جو لوگ مذہب سے واسطہ رکھتے ہیں انہیں اس کے ماننے میں تامل نہیں ہو سکتا کہ دنیا میں خداوند تعالیٰ انبیاء کرام کو بھیجتا رہا اور ان کے ذریعے سے انسانی تنظیم کا پیام سناتا رہا ہے۔ ہم مسلمان محمد عربی صلعم کو منجملہ اور نبیوں کے ایک نبی سمجھتے ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ قرآن کریم جو نبی اکرم صلعم کی زبانی ہم کو سنایا گیا ہے وہ ہمارے لئے خدا کا پیام ہے اور منزل من اللہ ہے۔ میں اس مضمون میں اسی موضوع پر ایک مختصر سی بحث کرنا چاہتا ہوں۔

یوں تو چھان بین کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ محمد عربی صلعم کے ورود اور ان کی آمد آمد کا اشارہ بہت سی پچھلی آسمانی کتابوں میں سے لیکن میں اس مبحث کو نظر انداز کرتا ہوں کیونکہ اس میں طرح طرح کی تاویلات کی گنجائش ہے۔ میں مختصر خود قرآن اور اس کی تعلیمات سے یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ کتاب منزل من اللہ ہے اور یہ کتاب ایک ایسا لائحہ عمل پیش کرتی ہے جس سے زیادہ مکمل نظام عملی زندگی کے لئے کسی اور کتاب نے پیش نہیں کیا۔

اس پر بحث کرتے ہوئے پہلے بہ حیثیت ایک مسلمان کے قرآن کو دیکھئے قرآن پاک اس دعوے کو بار بار دہراتا ہے کہ وہ منزل من اللہ ہے۔ مثلاً یَا اَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَاءَکُمْ بُرْھَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا۔ (النساء)

چوتھا ثبوت اس کے منزل من اللہ ہونے کا یہ ہے کہ یہ ایک کامیاب ہدایت نامہ ہے۔ قرآن پاک خود کہتا ہے :-

قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ط

کہہ دیجئے جو لوگ اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں وہ کامیاب نہیں ہوا کرتے۔

یعنی قرآن پاک کے اتباع سے کامیابی یقینی ہے اور اگر قرآن پاک کا ہدایت نامہ کامیاب نہ ہوتا تو بے شک اس کتاب کو خدا کی طرف منسوب کرنا ناروا ہوتا۔ اگر اس کامیابی کا ثبوت میں واقعات سے دینا چاہوں تو تاریخ کے اتنے ورق الٹنا پڑیں کہ آپ تھک جائیں اور ہماری کامیابی کی داستان ختم نہ ہو۔ ؎

بہیرد تشنہ مستسقی و دریا ہم چناں باقی

بزم و رزم اخلاق و قوانین، سیاست و تمدنیت، تہذیب و تمدن، علوم و فنون، غرضکہ کارگاہِ حیات میں کوئی گوشہ اور انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں کہ جس میں قرآن پر عمل کرنے والوں نے ایسی ترقی نہ کی ہو جسے دیکھ کر ایک مؤرخ انگشت بدنداں نہ ہو، اسے کیا کہیئے۔ اگر بدر و حنین اور قادسیہ و یرموک کی معرکہ آرائیاں ہمارے استقلال و ہمت اور جرأت کی آئینہ دار ہیں، تو اس کے ساتھ ہی فاتح بیت المقدس کا مفتوح رعایا سے حسن سلوک، ہماری معدلت گستری، کشادہ ظرفی، وسعت قلبی اور مذہبی رواداری پر شاہد ہے۔ ہماری حکمرانی و جہاں بانی کی داستانیں اگر دارا و سکندر کو شرمندہ کرتی ہیں تو علوم و فنون میں قرطبہ و صقلیہ کے کھنڈرات انی و بہزاد سے خراج تحسین حاصل کرتے ہیں۔ ہمارے قوانین و دساتیر اگر ہر ترقی یافتہ قوم کے لئے خضر راہ بنتے چلے جا رہے ہیں تو اخلاق محمدی اور اس دور کے اخلاق جب ہم قرآن پر عمل کرتے تھے فلسفۂ اخلاق کی بنیاد قرار پاتے ہیں۔ غرضکہ اسی قسم کی ہزارہا بینات پیش کی جا سکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن پاک بحیثیت ایک ہدایت نامہ کے بہت ہی کامیاب ثابت ہوتا ہے۔

اور آیت میں اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

قل فاتوا بکتاب من عند اللہ ھو اھدی منھما اتبعہ ان کنتم صادقین (القصص)۔

کہدیجئے کہ قرآن اور توریت کے علاوہ کوئی کتاب ایسی لاؤ جو ہدایت دینے میں بڑھا ہوا ہو میں اس کا اتباع کرلونگا اگر تم سچے ہو۔

آپ کہیں گے کہ اس میں توریت کو بھی قرآن کے ساتھ شامل کیا گیا ہے لیکن دوسری جگہ خود قرآن پاک ہی بتاتا ہے کہ توریت میں تحریف ہو چکی ہے اور یہی وجہ قرآن پاک اپنے نازل ہونے کی بتاتا ہے کہ کتب سابقہ سب محرف ہو چکی ہیں۔ یسمعون کلام اللہ ثم یحرفونہ۔

خود ان کتب کے ماننے والے ان کی تحریف کا اقرار کرتے ہیں اور ایک مشہور مفسر انا جیل پادری ڈلو کا بیان ہے کہ موسیٰ کی پانچ کتابیں اصل میں ایک شخص کی لکھی ہوئی نہیں ہیں بلکہ پہلی تحریروں کی بنا پر تالیف کی گئی ہیں۔ اس لئے اب ہمارے لیئے سب سے بہتر ہدایت نامہ قرآن پاک کے سوا اور کوئی کتاب نہیں رہی

تیسری ضروری چیز ایک الہامی کتاب کے لئے یہ ہے کہ وہ ایک مکمل دستور العمل ہو اور تمام انسانی ضروریات پر حاوی ہو۔ اس لحاظ سے قرآن پاک بہت ہی رفیع و اعلیٰ ہے اس کشمکش دنیا میں انسان طرح طرح کی آزمائشوں اور پیچیدگیوں سے دوچار ہوتا ہے کہیں حاکم ہوتا تو کہیں محکوم ہوتا ہے کہیں آقا ہوتا ہے تو کہیں خادم کہیں ثروت اور دولت کی نعمت سے مالا مال ہوتا ہے تو کہیں مکبت و مفلسی میں فاقہ کش۔ کہیں اپنے سینہ کو تیروں اور گولیوں کا ہدف پاتا ہے کہیں فتح و ظفر کے شادیانے بجاتا ہے کہیں زلزلہ کے جھٹکے آبادیوں کو تہ و بالا کرتے ہیں۔ کہیں جنگ و جدل کے شرارے خرمن امن پر برق پاش ہوتے ہیں کہیں وبائی بیماریاں خاندان کے خاندان کو برباد کر دیتی ہیں اور کہیں ہمہ گیر خانہ جنگیاں امن و عافیت کو پاش پاش کر دیتی ہیں۔ ان قسم صورتوں کے لئے عملی ہدایات کا دستور اگر کہیں ایک جگہ مل سکتا ہے تو وہ صرف قرآن پاک میں جس کے محکم اصول ابد الآباد تک اعلیٰ ترین منصب العین کا کام دیں گے۔

سر رابندر ناتھ ٹیگور نے اعلان کر دیا ہے :۔

"وہ وقت دور نہیں جبکہ قرآن اپنی ناقابل انکار صداقت اور روحانیت کے ذریعہ سے سب مذاہب کو اپنے اندر جذب کر لے گا۔"

مذہب سکھ کے بانی گورو نانک دیو جی کا ارشاد ہے۔

"توریت انجیل اور وید سب پڑھے۔ مگر قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو اس گمراہی کے زمانہ میں سب سے اعلیٰ اور ارفع ہدایت نامہ ثابت ہوا ہے۔"

مشہور جرمن فلسفی گوئٹے کا قول ہے :۔

"قرآن تبادل کلام میں برق کی طرح درخشندہ ہے۔ اس کتاب میں بڑی دلفریبی پائی جاتی ہے جس قدر ہم اس کے قریب پہونچتے ہیں وہ زیادہ اصلی معلوم ہوتی ہے اور بتدریج فریفتہ کرتی جاتی ہے پھر متعجب کرتی ہے اور آخرش ایک رقت آمیز تحیر میں ڈالدیتی ہے۔"

انسائیکلو پیڈیا برٹیانیکا کا مدیر کہتا ہے :۔

تمام مذہبی رہنماؤں اور انبیاء میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سب سے زیادہ کامیاب رہے۔ یہ ان لوگوں کی رائیں نہیں جو مذہبی پاسداری سے متاثر ہوں بلکہ ان لوگوں کا اعتراف ہے جو اپنے مذہبی عقاید کی فضیلت دلانے کے لئے اس اسلامی صحیفہ کی تنقیص کرتے ہیں۔ مگر اسی کو کہتے ہیں ؎ جا دوہ جو سر پہ چڑھ کے بولے

اس منزل من اللہ کتاب کی فضیلت سے یہ بال کی کھال نکالنے والے نقاد بھی انکار نہیں کر سکتے۔ کیا کوئی انسانی زور قلم کا بڑے سے بڑا شاہکار بھی یہ عالمگیر خراج تحسین وصول کر سکتا ہے۔

اب قرآنی تعلیمات کی نوعیت پر ذرا نظر ڈالئے۔ فرصت ہوتی تو میں انسانی زندگی کا ایک ایک رُخ لیتا اور تمام دنیا کی کتب مقدسہ کی تعلیمات کے مقابلہ میں قرآنی تعلیمات کو پیش کر کے دکھاتا کہ دیگر تعلیمات سے قرآنی تعلیمات عملاً کس قدر ارفع اور اعلیٰ ہیں یہاں اس طوالت کی گنجائش نہیں لہٰذا مشتے نمونہ از خروارے، قرآنی تعلیمات کی چند خصوصیات آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

اب غیر مسلموں کے نقطۂ نظر سے کلام ربانی کا ثبوت ملاحظہ فرمایئے۔ طوالت کے خوف سے صرف دو باتیں پیش کرنا چاہتا ہوں اول تو غیر مسلم مشاہیر کی رائے اس کتاب کے بارے میں کیا ہے اور دوسرے اس کی تعلیم کی نوعیت، غیر مسلموں کی رائے کے سلسلہ میں آپ کے سامنے حسب ذیل اقتباسات پیش کرنا چاہتا ہوں۔

ریورینڈ لیسی اولبری فرماتے ہیں۔۔

"قرآن دلوں کو مسخر کر لینے کے لئے کافی سے زیادہ طاقتور ہے۔"

ریورینڈ جی مارگولیتھ کا قول ہے۔

"دنیا کی مذہبی کتابوں میں قرآن بلاشبہ ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے اس نے ذہن انسانی میں ایک بالکل اچھوتے تخیل کی بنیاد ڈالی۔ اور ایک بہترین قسم کے کیریکٹر کا نمونہ پیش کیا ہے۔"

سر ولیم میور فرماتے ہیں۔۔

"قرآن ہستی باری تعالیٰ کی متعلق مظاہر قدرت سے عجیب عجیب دلائل مستنبط کرتا ہے۔"

ڈین اسٹینلی کا ارشاد ہے۔۔

"ایک محدود دائرے کے اندر قرآن کا ضابطہ یقیناً انجیل کے ضابطے سے بڑھ کر دل پہ گہرا نقش چھوڑتا ہے۔"

واشنگٹن ارونگ نے صاف کہہ دیا کہ۔

قرآن کے اسلوب اور انداز میں ایک ایسی دلکشی ہے جس کی نظیر پیدا نہیں کی جا سکتی۔

ریورنڈ باسورتھ اسمتھ پاپولر انسائیکلوپیڈیا میں فرماتے ہیں۔

"قرآن بلاشک و شبہ ایک معجزہ ہے۔"

مہاتما گاندھی نے کہا ہے۔

"میں نے قرآن کا مطالعہ کیا مجھے اس کی سب سے بڑی خوبی یہ نظر آئی کہ یہ فطرت انسانی کے بالکل مطابق ہے۔"

ہم نماز میں اکثر سورہ ماعون کی تلاوت کرتے ہیں لیکن ہم اس پر کبھی غور نہیں کرتے۔ اس میں مذہب خلق ہی کو دین کا مرادف بنایا گیا ہے۔ اَرَءَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ فَذٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝

یہ خیال کہ محض نماز روزہ کے رسوم ادا کرنے سے ہم سچے دیندار مسلمان ہو سکتے ہیں قطعی غلط ہے فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ الَّذِينَ هُمْ يُرَآءُونَ وَيَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ ۝

اگر ہم اس نکتہ کو سمجھیں جو ان دو مختصر یعنی رب العالمین و رحمۃ اللعالمین کے الفاظ میں پنہاں ہے تو ہمیں واضح ہو جائے گا کہ کمال انسانی کے حصول کے لئے نہ صرف اپنے قبیلے یا گروہ یا قوم بلکہ تمام نوع انسانی اور کائنات کی مخلوق کی خدمت ضروری ہے۔

قرآن پاک تمام انسانوں کی خود ساختہ بندشوں کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ذات پات کا اختلاف کیا بلکہ قبیلوں کے اختلاف سے بھی پرہیز کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ۝

وہ دنیاوی گروہ بندیوں کے بھی خلاف ہے۔ چنانچہ فرعون کے وقت میں حضرت موسیٰ کے مبعوث ہونے کے جو وجوہ بیان کئے گئے ہیں ان میں سے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ فرعون نے تمام قوم کو فرقوں میں تقسیم کر دیا تھا جیسا کہ ارشاد ہے اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا ۝

ایک اور آیت ہے کہ

اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۝

قرآن پاک تمام دنیاوی معاملات میں انتہائی ایمانداری اور دیانت داری کی تعلیم دیتا ہے جس کے متعلق وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا آیت ملاحظہ فرما چکے ہیں اور ایسی آیات بہ تعداد کثیر جمع کی جا سکتی ہیں۔

یاد رکھئے کہ قرآن پاک کی تعلیم پر غور کرتے وقت ایک بات کا لحاظ ضروری ہے اور وہ یہ
کہ قرآن پاک محض خیالی نظریات نہیں پیش کرتا بلکہ عملی دستور پیش کرتا ہے۔ اس لئے بہت
ممکن ہے کہ آپ کو بہت سی کتابوں میں ایسے نظریات ملیں جو پڑھتے وقت آپ کو بہت اچھے معلوم
ہوں اور آپ تھوڑی دیر کے لئے اس کی خوشنمائی سے متاثر ہو جائیں اور اس کے مقابلہ میں قرآنی
تعلیمات آپ کو کم تر نظر آنے لگیں مگر جب عملی دنیا میں آپ دونوں اصول کو آزمائیں گے تو قرآن پاک
ہی کے اصول کو سچا پائیں گے مثلاً عیسائیت کی یہ ایک مشہور تعلیم ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے
ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اس کے سامنے کر دو لیکن آپ خود دیکھئے کہ کبھی اس اصول
پر عمل کر کے کامیابی ہو سکتی ہے۔ اگر یہ اصول عملی دنیا میں چلتا تو آج کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔ نبی کریم
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے مقابل بطور نظریہ کے اَحْسِنْ اِلٰی مَنْ اَسٰی کی طرف توجہ
کرتے ہیں لیکن عملی اصول کیلئے قرآن میں یہ ارشاد ہوتا ہے وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنَّ النَّفْسَ
بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ
بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ط۔ قرآن پاک خدا کی وحدانیت اور عبودیت کا بار بار
ڈنکا بجاتا ہے لیکن اس کے باوجود حق العباد کو حق اللہ پر ترجیح دیتا ہے اور معاشرتی زندگی کا
یہ بہترین اصول ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ
اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ
عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۔
اور نماز کا ذکر اس کے بعد آتا ہے۔ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ پھر وہی معاشرتی
زندگی کے اصول آ جاتے ہیں۔ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ
فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۔

عورت کی مرضی کے خلاف شادی کی صاف ممانعت موجود ہے۔ اسی طرح طلاق کے معاملہ میں بھی عام طور پر چاہے جو اصول جاری ہو گئے ہوں لیکن قرآن کی رو سے مرد و عورت کو برابر حقوق دیئے گئے ہیں چنانچہ ارشاد ہوتا ہے فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بہ اسی کی تائید بخاری کی اس حدیث سے ہوتی ہے کہ ثابت ابن قیس کی بیوی جمیلہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئیں اور کہا کہ میں اپنے شوہر سے طلاق لینا چاہتی ہوں آپ نے دریافت فرمایا کہ کیوں تو کہا کہ نبھتی نہیں ہے۔ چنانچہ رسول اکرمؐ کی وساطت سے مہر واپس کرکے طلاق حاصل کر لی۔

غلامی کے خلاف داعیٔ اسلام نے بہت نمایاں خدمات لی ہیں۔ اس زمانہ میں جبکہ ساری دنیا میں غلامی کی رسم جاری تھی اور غلامی کا قطعی الغاء ناممکن تھا داعیٔ اسلام نے صرف غلاموں کو آزاد ہی کرنے کی تعلیم نہیں دی بلکہ وہ نمونہ بھی پیش کیا جس سے یہ رسم دنیا سے معدوم ہو جائے۔ چنانچہ زیدؓ کی شادی حضرت زینبؓ سے کی گئی جو آنحضرت صلعم کی حقیقی پھوپھی کی بیٹی تھیں۔ اور بلالؓ کی شادی بنی قریش میں کی گئی اس کے علاوہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ کے اصول کا اعلان کرکے غلام و غیر غلام کا امتیاز مٹا دیا۔ خود ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ کی ایک مثال موجود ہے کہ غلاموں کے ایک خاندان نے یہاں حکمرانی کی ہے جس کی حکومت کو مسلمانوں کے ہر فرقہ نے بلا لحاظ نسل و خاندان تسلیم کیا تھا۔ اسلامی مساوات کا اعتراف چونکہ آج کل متعصب ترین منی جنس سلام کو بھی ہے اس لئے اس پر زیادہ روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔

معاشرتی قوانین میں قرآن کریم نے فطرت انسانی کے نازک سے نازک گوشہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے وکامل ترین اصول بنائے ہیں ان کی تشریح و تبیین کے لئے تو ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں ان ہی اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے ان سے معلوم ہو جائے گا کہ جہاں ایک طرف یہ صورت ہے کہ انسانی قوانین کی مشکلات حل کرنے کے لئے بڑے بڑے ارباب سیاست و دانش سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور ناکام اٹھ کھڑے ہوتے ہیں وہاں آج چودہ سو برس پہلے ایک جاہل قوم میں ایک اُمّی سرزمین میں ایک مرد مامور من اللہ کی وساطت سے جو دستور اساسی نوع انسان کو دیا گیا وہ آج ـــــ

تاریخ شاہد ہے کہ جس وقت داعیٔ اسلام دنیا میں آئے۔ اس وقت دنیا میں عورتیں بڑی ذلیل حالت میں تھیں، اکثر ملکوں میں تو اس وقت لڑکی کا پیدا ہونا نہایت منحوس سمجھا جاتا تھا اور اکثر ممالک میں لڑکیاں زندہ دفن کردی جاتی تھیں یا طرح طرح کے حیلوں سے انھیں ختم کر دیا جاتا تھا اور کسی قانون نے اس وقت تک عورتوں کو کسی قسم کا حق نہیں دیا تھا۔ اسلام نے سب سے پہلے عورتوں کی اس خستہ حالی کے خلاف صدا بلند کی اور مردوں کو عورتوں کی حفاظت کی تعلیم تو ضروریہ کہہ کردی کہ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ ط

لیکن اسی کے ساتھ ان کو ایسے حقوق دئے کہ ان کو تقریباً اسی رتبہ تک پہنچا دیا جس پر مرد تھے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ " مرد پر بھی وہی واجب ہے جو عورت پر"۔ ہندوؤں میں آج بھی جائداد پر عورتوں کا حق نہیں ہے اور واضعانِ قانون اس کے لئے پریشان ہیں اور نئے نئے قانون بنا رہے ہیں لیکن داعیٔ اسلام نے عورتوں کو پہلے ہی جائداد پر حق دیدیا تھا۔

یہیں پر ایک بات اور کہنے کی ہے کہ دیکھئے آج بھی عیسائی تمدن میں باوجود تمام ترقیوں کے یہہ بات موجود ہے کہ شادی کے بعد عورت اپنا نام تک کھو بیٹھتی ہے اور شوہر کے نام پر اُسے پکارا جاتا ہے جس کی تقلید بدقسمتی سے آج کل ہم لوگ کرنے لگے ہیں۔ لیکن اسلامی تمدن میں کبھی آپ یہ نہ پائیں گے، عورت ہمیشہ اپنا نام برقرار رکھتی تھی یا اگر دوسرے کا نام شامل ہوتا تھا تو جس طرح باپ کا اسی طرح ماں کا۔

شادی بیاہ آج بھی مختلف مذاہب میں صرف ایک رسم ہے لیکن اسلام میں سب سے پہلے اس کو معاہدہ کی حیثیت دی گئی۔ چنانچہ آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں نکاح ایک معاہدہ ہے اور اسی وجہ سے اس میں معاہدہ کے تمام شرائط ادا کئے جاتے ہیں۔ اسی اصول کی بنا پر اسلام نے یہ لازم کردیا کہ دونوں فریق جو آپس میں نکاح کریں وہ ایک دوسرے کو پسند کرلیں چنانچہ فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ میں صاف یہی اشارہ ہے اسی طرح اس آیت میں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ط

اسلام اور سرمایہ دار و مزدور

سرمایہ دار اور مزدور کے الفاظ ممکن ہے حیثیت سے نئے ہوں لیکن اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ امیر و غریب کا طبقہ ان کے وجود میں آنے سے ہمیشہ رہا ہے ان دو طبقوں میں ایک کی تن آسانی اور دوسرے کی جانفشانی یا ایک کی آسودگی اور دوسرے کی درماندگی سے تفریق و امتیاز کی خلیج حائل اور وسیع ہوتی چلی گئی۔ اس کو دنیا کے مفاد میں درست مٹانے کی طرف کسی نے توجہ اور دنیا والوں کو اس پر توجہ بھی دلائی مگر اس کا ثبوت دستیاب نہ ہو سکا کہ اسلام سے پہلے کسی مذہب یا تمدن نے عملی نقطہ نگاہ سے بھی اس پر غور کیا ہے۔

اسلام نے اس مزدور و الاصلاح امر کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس کو عملی جامہ پہنانے کی سعی جمیل بروئے کار آنے لگی۔ یہ ناممکن تھا اور ہے کہ تمام دنیا کی اقتصادی و معاشرتی حالت ایک سطح پر کر دی جائے لیکن تفریق و تفاوت باہمی کی اس وسیع خلیج کو بہت کچھ تنگ کیا جا سکتا تھا اور کیا جا سکتا ہے۔ اس خیال کو مدنظر رکھتے ہوئے مال و اسباب کے متعلق اسلام نے جتنے اصول وضع کئے ان میں دو پہلو خاص طور پر ملحوظ رکھے (۱) یہ کہ متمول یا سرمایہ دار طبقہ اپنے مال و سرمایہ سے صرف خود ہی متمتع اور جالب منفعت نہ ہو بلکہ قوم کے ضعیف الحال اور پسماندہ غریب افراد کو بھی فیض پہنچے تا کہ یہی سرمایہ گردش میں سب سرمایہ اور زبوں حالی نوع انسان کو بھول نہ جائے، ان کو ذلت کی نظر سے نہ دیکھے۔ (۲) یہ کہ اپنی طاقت و سرمایہ سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مزدور سے خوف دہشت یا ان سے مفت یا ناجائز دباؤ ڈال کر طاقت سے زیادہ کام نہ لے۔ ان کو اپنا غلام نہ سمجھے اور ان کی مقررہ اجرت میں کمی نہ کرے۔

چنانچہ قرآن کریم میں غربا و مساکین کی امداد کے لئے بیسیوں مرتبہ ترغیب و تحریص فرمائی گئی ہے کہ:-

انسانی معاشرت و فطرت کے کسی تقاضے میں پیچھے نہیں رہا۔

کیا یہی ایک ثبوت اس بات کے لئے کافی نہیں کہ قرآن کریم اللہ کا کلام ہے کسی انسان کا نہیں اور پھر کیا یہی ایک زندہ جاوید معجزہ ایسا نہیں جو قرآن لانے والے نبی اکرم ﷺ کی صداقت کی زندہ دلیل ہو۔ خدا حی و قیوم ہے۔ اس کا کلام بھی قیامت تک جیتا جاگتا رہیگا اور اسی لئے اس کا رسول بھی نوعِ انسانی کی بقا تک اُن کے لئے ہادی و طریقت رہیگا۔

سو دانے ہوں یعنی مال کی جتنی تعداد خلوص قلب سے راہ خدا میں صرف کرو اس کا سات سو گنا اجر اللہ کی طرف سے تم کو ملے گا اور جس کو چاہے اس سے دو چند عطا فرمائے گا پھر یہ بھی تاکید فرمائی گئی ہے کہ اس مالی ایثار کے بعد کسی پر احسان نہ جتاؤ اور نہ ایسا برتاؤ کرو جو مستحق امداد و اعانت کے لئے موجب آزار بن جائے تو تمہیں ان اعمال حسنہ کا بہترین اجر بارگاہ پروردگار سے ملیگا اور تم تمام خطرات اور غموں سے محفوظ رہو گے۔ یہاں بخوف طوالت یہ مسلسل آیات اور ان کا ترجمہ پیش نہیں کیا جاتا۔ یہ پوری تفصیل پاکیزہ ترین اور بغایت دلنشیں الفاظ میں سورۂ بقرہ کے رکوع ۳۶ میں موجود ہے۔ غربا و مساکین کے لئے موجب آزار ہونے اور ریاکاری سے شدت کیساتھ ممانعت کی گئی ہے اور فرمایا گیا ہے کہ ایثار و ہمدردی نوع انسان میں پختگی پیدا کرو۔ اب اس ہمدردانہ سلوک کیلئے ہر قسم کے مستحقین کو بیان کر دیا گیا ہے۔ والدین، اعزہ و اقارب، رشتہ دار، یتامیٰ، بیوائیں، غربا، مساکین، مسافر، آزاد شدہ قیدی جن کے پاس مال نہ ہو، بیمار و اپاہج، غرض کوئی جماعت جو مستحق امداد ہو اس کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ چنانچہ امداد کی اس ہمہ گیری کے پیش نظر زکوٰۃ کا ایک ایسا مکمل سسٹم قائم کر دیا گیا جس کی مثال دنیا کی کسی قوم میں اس نظام کے ساتھ موجود نہیں۔ تاریخ اسلامی کے مطالعہ سے واضح ہوگا۔ کہ اسلام کی اسی تعلیم مساوات اور ایثار و ہمدردی کی تبلیغ نے سرمایہ دار اور غیر سرمایہ دار کے فرق و تفاوت کو اس درجہ معدوم کر دیا تھا کہ زکوٰۃ کا روپیہ بیت المال میں جمع ہوتا تھا اور کوئی غریب و حاجتمند ایسا نہیں پایا جاتا تھا جو زکوٰۃ لینے کا مستحق ہو۔

بہرحال یہ تمام امور خیر اور ہمدردی و ایثار کے جذبات سرمایہ کی بدولت ہی صورت پذیر ہو سکتے ہیں اور اس نوعیت سے سرمایہ کو یقیناً رحمت خداوندی کہا جا سکتا ہے۔ اسی لئے اسلام مطلقاً سرمایہ داری کے خلاف نہیں اور نہ اسلام کے نزدیک سرمایہ داری یا مال و دولت کوئی معیار فضیلت و برتری ہے۔ اسلام محض اس بنا پر کہ ایک شخص دولتمند ہے یا صاحب قوت و وجاہت اور کسی بڑے خاندان کا فرد ہے اس کو کوئی فوقیت نہیں دیتا۔ یہاں تو صرف اتقا و پرہیزگاری کو معیار فضیلت قرار دیا جاتا ہے۔ جس میں یہ تمام مذکورہ بالا اوصاف یعنی عدم تفاخر ادائیگی حقوق جانی و مالی ایثار و ہمدردی

لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون ط جب تک تم اپنی محبوب شے (مال و دولت کو) خدا کی راہ (یعنی امداد غربا و مساکین) کے لئے خرچ نہ کرو گے تمھیں نیکی حاصل نہیں ہو سکتی

اطعموا البائس الفقیر } فقیر و محتاج کو کھانا کھلاؤ۔

اطعموا القانع والمعتر } قانع اور نہ مانگنے والے محتاج کو کھانا کھلاؤ۔

غلاموں اور مجبور و مقید انسانوں کی امداد و پرورش کیلئے حکم ہوتا ہے۔ وآتوھم من مال اللذی اتاکم۔ تم خدا کے عطا کردہ مال میں سے ان کو بھی دو۔ پھر اس داد و دہش کے ساتھ ہی یہ بھی ہدایت ہوتی ہے کہ اپنے اموال و اسباب میں سے بہترین اور عمدہ مال و اسباب دیا کرو۔ وانفقوا من طیبٰت ما کسبتم۔

پھر یہ تاکید بذات خود کمائے اور حاصل کئے ہوئے مال ہی کے متعلق نہیں بلکہ اگر تم وراثتہً بھی کسی سرمایہ و جائیداد کے وارث و مالک ہوئے ہو۔ تو اس میں سے بھی اسی طرح خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔ وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ ط جو مال تمھیں وراثتاً ملا ہے اس میں سے بھی اسی طرح خرچ کیا کرو۔ یک یہ پہلو بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیئے کہ غریبوں کمزوروں اور مساکین حاجتمندوں کی عام امداد کے لئے کوئی خاص مقدار اور شرط نہیں مقرر کی گئی بلکہ فرمایا گیا کہ جتنا تم آسانی سے خرچ کر سکتے ہو کرو۔ یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو! یہ لوگ آپ سے مصارف خیر میں صرف کرنے کی مقدار کو پوچھتے ہیں کہ کتنا صرف کرنا چاہیئے۔ کہدیجئے کہ جسقدر اپنی ضرورت سے زیادہ ہو اور گراں نہ گزرے۔

اس کے ساتھ ہی مسلمان کو اس خرچ کرنے کے نتائج سے بھی آگاہ کر دیا گیا کہ تمھارے اس مالی ایثار کا نتیجہ یہ ہے کہ ظاہری و باطنی پاکیزگی حاصل ہوگی اور تم کو دعائیں دی جائیں گی۔ فرمایا گیا کہ "خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم بھا وصل علیہ۔ اس سے بڑھ کر ایک اور آیۃ میں اس انفاق فی سبیل اللہ کا اجر بتایا گیا ہے کہ جو لوگ خدا کی راہ میں ایثار کریں گے اُن کی مثال ایسی ہوگی جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اُس سے سات بالیں اگیں اور ہر بال میں

رنج بے مایگی سے افسردگی و ملال یا حسد میں مبتلا ہو کر قعر ہلاکت میں نہ گرو بلکہ ہمت مردانہ سے سعی پیہم میں لگے رہو تو منزل کامیابی تمھارے سامنے آجائے گی اس کے ساتھ ہی اسلام ہمیں یہ سبق بھی دیتا ہے کہ دنیوی زندگی کا یہ تمول اور عیش و عشرت کا یہ ساز و سامان چند روزہ کامرانی ہے۔ تمہیں دوسری دنیا کی فوز و فلاح کا خیال رکھنا ضروری ہے جو صرف خدا سے ڈرنے والوں ہی کا حصہ ہے۔ رفعت و پستی کے ان مدارج کو قائم رکھنے کی اسلام میں ایک اور حکمت بھی پنہاں ہے اور وہ منجانب اللہ انسانوں کی آزمائش ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔ تم کو ایک دوسرے پر یہ خصوصی رفعت اس لئے دی گئی ہے کہ تمھاری آزمائش ہو سکے ورفع بعضکم فوق بعض درجات لیبلوکم فی ما اٰتٰکم مشیت ایزدی نے ہم کو امت واحد اور ایک جماعت بھی اسی لئے نہیں بنایا کہ اس کے عطا فرمودہ مال و متاع میں ہماری آزمائش ہو سکے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ ولو شاء اللہ لجعلکم امۃ واحدۃ ولکن لیبلوکم فی ما اٰتٰکم فاستبقوا الخیرات۔ اسلام ہم کو سرمایہ سے سرفراز فرمانے کے ساتھ ہی امور خیر امداد مستحقین و اہل حاجت میں سبقت کا حکم دیتا ہے۔

غرض اسلام نے سرمایہ داری کو جائز رکھتے ہوئے بنی نوع کی ہمدردی۔ خدمت۔ راحت رسانی، امداد اور عملی مساوات پر اس قدر زور دیا ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب اور کوئی قوم اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ ان تمام خصوصیات میں اسلام نے آقا و غلام چھوٹے بڑے اور سرمایہ دار و مزدور کے فرق کو عملاً بالکل اٹھا دیا ہے جو مساوات کا حقیقی مفہوم ہے۔

آغاز مضمون میں مال و اسباب کے متعلق اسلامی اصول کے دو پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ ایک پہلو یعنی جواز سرمایہ داری اس کے مقصد اور فوائد و حکمت پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ اب دوسرے پہلو یعنی مزدوروں کے ساتھ سلوک کے متعلق مختصراً عرض کر دیا جاتا ہے۔

حسن معاملہ اور دوسروں کے مال (اور حق) میں ناجائز تصرف کی ممانعت

مسلمانو! ایک دوسرے کا مال (حق) ناجائز طور پر ہضم نہ کرو۔ لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل۔ ظاہر ہے کہ مزدور کی حق تلفی کرنا اس کو اس کی محنت سے کم اجرت دینا بھی گویا اس کے اس مال میں ناجائز

بنی نوع انسان کے ساتھ حسن سلوک اور عدم آزار دہی داخل ہیں۔ پھر اسلام کے قانون وراثت نے سرمایہ داری کے موجودہ مفہوم اور نوعیت کی بیخ پر پہلے ہی تیشہ رکھ دیا ہے۔ اس قانون کی وجہ سے اگر غور کیا جائے تو سرمایہ داری کی بنیاد قائم ہونا ہی دشوار ہے۔

لیکن مال و دولت کے اعتبار سے چونکہ بنی نوع انسان کے مدارج کا اختلاف اقتضائے فطرت ہے اور کاروبار عالم قائم رکھنے کے لئے ضروری۔ اس لئے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا کہ نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیوۃ الدنیا ورفعنا بعضھم فوق بعض درجات لیتخذ بعضھم بعضا سخریا الخ۔ حیات دنیوی میں تقسیم معاش اور ایک دوسرے کے درجات میں (ظاہری) رفعت و فوقیت ہمارا ایک حکیمانہ نظام ہے جسکی وجہ سے ایک دوسرے سے کام لیتا رہیگا الخ

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطری قابلیت اور ممالک عالم کے ذرائع وسعت میں تدریجی، اور غیر محدود ترقی اس بات کو بتاتی ہے کہ دولت اور ذرائع دولت کا کوئی ایک معیار نہ تو انسان کے افراد کی بنا پر اور نہ ممالک کے حدود کی بنا پر ممکن ہے۔ چنانچہ اسلام دولت کی مساویانہ تقسیم سے روکتا اور اس کو کفران نعمت سے تعبیر کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق فما الذین فضلوا برادی رزقھم علی ما ملکت ایمانھم فھم فیہ سواء افبنعمۃ اللہ یجحدون ۔ اس لئے خداوند تعالے نے اپنے دین فطرت اسلام میں تمول کے اس فطری اختلاف مدارج کو قائم رکھا۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی ہدایت فرمادی۔ کہ تم دوسرے کے تمول و سرمایہ اور اپنی بے مائگی کو دیکھ کر دوسروں پر حسد نہ کرنا اور فضیلت تمول کی تمنا و آرزو میں اُلجھ کر نہ رہ جانا ولا تتمنوا ما فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض۔ لیکن یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ تفریق مدارج پیدائشی ہے۔ نہیں نہیں یہ نیرنگئ قدرت تمہاری قابلیت و استعداد کے اختلاف پر مبنی ہے لکل درجت مما عملوا تم اپنی مساعی جمیلہ سے ایسی استعداد پیدا کرلو گے تو ہماری طرف سے یہ مسرت خیز اور ہمت افزا مژدہ بھی سُن لو کہ تم کو وہی کچھ ملیگا۔ جس کی تم کوشش کرو گے۔ لیس للانسان الا ما سعی۔

کو پس پشت ڈالدیا۔ اور سرمایہ دار و مزدور طبقات میں افتراق و تفاوت حال کی ایک وسیع خلیج حائل کردی۔ آج بھی اگر یہ خلیج بند اور تنگ ہوسکتی ہے اور دنیا چاہتی ہے کہ یہ شورشیں، ہنگامے، ہڑتالیں اور ایک دوسرے کے خلاف عناد و بغض کے جذبات کا خاتمہ ہوجائے تو اس کا صرف ایک ہی راستہ ہے۔

"اسلامی اصول سرمایہ و محنت کی پابندی"

اسلامی اصول سرمایہ و محنت کے ماتحت تقسیم کار سے کچھ شک نہیں کہ خارزار زینت سراپا چمن ہوسکتا ہے اور بغیر کسی تردد کے کہا جاسکتا ہے کہ ؎

نہ بینی کہ از قسمتِ کار زلیست
سراپا چمن می شود خار زلیست

تصرف کرتا ہے جو اُس کو حاصل ہوتا۔ قرآن حکیم معاوضہ بالمثل میں کمی کرنے والوں کو خسران المبین کی وعید سے ڈراتا ہے۔ اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون ۵ کے ذیل میں معاوضہ بالمثل کی تمام فروعات شامل ہیں۔ دوسروں سے محنت پوری پوری لینا اور اس کے مقابلہ میں معاوضہ، مزدوری کم دینا اسلام کے نزدیک ظلم ہے۔ اسلام کے نزدیک کاریگر اور مزدور اپنے پورے معاوضہ کا مستحق ہے۔ رسول کریم علیہ التسلیم نے ایک حدیث میں اس کی بھی سخت تاکید فرمائی ہے کہ:۔ "مزدور کو اُس کی پوری پوری مزدوری اُس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے پہلے دیدو"

مزید تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اسلامی تعلیم اور ہدایات کے دائرہ میں نہ صحیح معنی میں سرمایہ داری مکروہ و مذموم ہے اور نہ کاشتکاری و مزدوری، ذلت و تنگدستی کا موجب۔ اسلام نے دونوں طبقوں کو ایک دوسرے کا ہمدرد و شریک حال بنانے اور اُن کو قریب تر لانے کی جو مبارک سعی فرمائی ہے وہ بالکل مطابق فطرت اور عین عدل و انصاف کا مظہر ہے۔ بنی نوع انسان کی آبادی و خوشحالی امن و امان اور باہمی ارتباط و اتحاد کی جو مثالیں اسلامی "اصول سرمایہ و محنت" کی پابندی سے برروئے کار آسکتی ہیں وہ کسی دوسرے طریق کار سے نہیں حاصل ہو سکتیں۔ ایک مسلم سرمایہ دار کے لئے اسلام اپنے بہتیرے کردہ "اصول سرمایہ و محنت" کو لازمی قرار دیتا اور اُس کی ذات کے لئے مفید بتاتا ہے کہ ع

"مزدور خوشدل کند کار بیش"

اسی بنا پر اسلام کے قرون اولیٰ میں شاید ہی کوئی ایسی مثال مل سکے کہ ایک شخص اپنے جسم و دماغ سے کام لئے بغیر محض دوسروں کی محنت و مزدوری سے نفع اٹھا کر امیر و سرمایہ دار بن گیا ہو۔ قرون اولیٰ کی اسلامی تاریخ کا مطالعہ کر جائیے۔ جو لوگ آپ کو متمول نظر آئیں گے اُن کی تاریخ ترقی و تمول اُن کی جسمانی و دماغی محنتوں، دست و پا کی عملی حرکتوں اور صحیح و جائز جد و جہد کے کارناموں سے معمور نظر آئیگی۔ اسی طرح مزدور طبقہ کی طرف سے بھی کوئی شکایت اور ان کی تباہ حالی کا منظر آپ نہ دیکھ سکینگے۔ لیکن افسوس ہے کہ مرور زمانہ کے ساتھ ہماری بے عملی اور خود غرض سرمایہ داروں کی غلط اندیشی نے "اسلامی اصول سرمایہ و محنت"

خطرہ میں پڑ جاتی تھیں، ہزاروں گھر مسمار اور لاکھوں خاندان خانماں برباد ہو جاتے تھے۔ غرضکہ لوگوں پر دنیا تنگ ہو جاتی تھی۔ چنگیز خاں، ہلاکو، تیمور اور نادر شاہ کے مظالم کی داستانیں ابھی تک لوگوں کے حافظہ میں تازہ اور صفحاتِ تاریخ میں پوشیدہ ہیں۔ فی الحقیقت یہ واقعات اہلِ بصیرت کے لئے تازیانۂ عبرت ہیں۔

مگر دراصل یہ نظریہ وطنیت جذبۂ بہیمیت کا پیدا کردہ ہے۔ اصلی اور سچی وطنیت تو ایک ایسا جذبہ ہے جو محبت و ہمدردی سے پیدا ہی نہیں ہوتا بلکہ محبت و ہمدردی کے دائرہ سے نکل کر باہر نہیں جا سکتا۔ یہ جذبہ فی الحقیقت ایک بہت بڑے وسیع اور ہمہ گیر جذبۂ ہمدردی نوعِ انسان کا ایک جزو ہے۔ انسان کی خلقت پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے انسان کی آفرینش کی اصلی غرض و غایت ہمدردی انسانی ہے۔ اگر یہ جذبہ فطرت کے مدِ نظر نہ ہوتا تو آج انسانی خلقت کچھ اور ہوتی۔ نہ اس میں خلق ہوتا نہ غیرت، نہ محبت، نہ شرافت۔ اس لئے ظاہر ہے کہ یہ جذبہ فی الحقیقت جذبہ فطرت ہے۔ لیکن یہ بھی فطرت ہے کہ انسان کا دل و دماغ پہلے اس چھوٹے سے حلقے سے متاثر ہوتا ہے جو ہمہ وقت اس کے گرد و پیش رہتا ہے۔ مثلاً ایک گاؤں کا رہنے والا پہلے اپنے گاؤں سے محبت کرے گا پھر دوسرے گاؤں سے۔ اسی طرح ایک شہری پہلے اپنے شہر سے ہمدردی کرے گا بعد میں دوسرے شہر سے۔ یہ جذبہ جن کیفیات سے قوت پکڑتا ہے وہ اسے اس حد تک آسانی سے لیجاتے ہیں جہاں تک جذبات کے قوی کرنے کے اسباب کافی ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک ہندی کو ہندوستان سے وہ محبت ہو جو اسے ہندوستان سے باہر کے کسی ملک سے نہ ہو تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اس سرزمین سے جسے ہندوستان کہتے ہیں اس کے تعلقات اس قدر وجوہ پر مبنی ہیں۔ جو وجوہ و ممالک کے ساتھ تعلقات رکھنے کے لئے حاوی نہیں ہیں۔ مثلاً ایک قسم کی بود و باش۔ ایک قسم کے نظام سے تعلق۔ ایک قسم کے روایات میں بسر کرنا۔ ایک قسم کی خوشیاں۔ ایک قسم کے رنج۔ دن رات یہ کیفیات و اسباب غیر محسوس طور پر انسان کے دل و دماغ پر ایسا عمل اور باز عمل کرتے رہتے ہیں جو ایک ہندی کے لئے دوسرے ممالک سے تعلق رکھنے میں نہیں کرتے۔ اسی طرح اس ملک سے باہر والوں سے اس کی جو ہمدردی ہوگی اس میں جتنے اسباب

اسلام اور وطنیت

وطنیت کیا ہے؟ آج وطنیت کا مفہوم اقوام عالم کے اعمال و کردار پر نظر ڈالنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وطنیت ایک ایسا جذبہ ہے جس کے تحت انسان ہر وہ کام جو اپنے وطن کے حق میں مفید ہو کر سکتا ہے، عام اس سے کہ خود وہ کام اپنی ذات سے مستحسن و محمود ہے یا قابل ملامت۔ مثلاً اگر وطن غریب و نادار ہے تو دوسری اقوام و ملل پر قبضہ و تسلط کر کے اپنے وطن کو دولت سے مالا مال کرنا اس جذبہ کے تحت ناروا نہیں سمجھا جاتا۔ کشت و خون، قتل و غارت گری، بے قصور عورتوں اور معصوم بچوں کو ہلاک کرنا، عام آبادی پر بم برسانا خوبصورت اور عالیشان عمارتوں کو تباہ و مسمار کرنا، غرض کہ ہر وہ سفاکانہ فعل جو انفرادی طور پر اور از روئے انصاف بمنزلہ گناہِ کبیرہ اور فعل قبیحہ کے ہے اپنے وطن کی محبت میں جائز سمجھا جاتا ہے۔ حبشہ کا جو حشر ہوا وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے، چین میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ یہ تمام واقعات اسی جذبہ یعنی وطن کی محبت کے زیر اثر رونما ہو رہے ہیں۔

اس قسم کے واقعات تو پہلے بھی ہوئے ہیں۔ اسی زمانہ کے لئے یہ واقعات مخصوص نہیں۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو پہلے اس طرح کے واقعات اس نام نہاد جذبہ کے ماتحت سرزد نہیں ہوتے تھے۔ ان کی تہ میں دوسرا اثر کام کرتا تھا۔ یعنی یہ تباہ کاریاں سلطنتوں اور بادشاہوں کے ذاتی تخیل و ہوس کی بنا پر اور ان کی اس خواہش کی وجہ سے ہوتی تھیں کہ ان کا اقتدار دنیا میں اوج پذیر ہو۔ اور اُن کی ذاتی دولت میں اضافہ ہو۔ چنانچہ اُس وقت بھی طرح طرح کے کشت و خون ہوتے تھے، جبر و تعدی کے مناظر دیکھنے میں آتے تھے۔ ظلم و ستم کے آسمان ٹوٹتے تھے عورتوں کے ناموس اور بچوں کی جانیں

واحب ارض اللہ الی اللہ۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک انسان کے لئے وطن مخصوص کی محبت فطری امر ہے اس لئے کہ وہ اس زمین کی پیداوار ہے۔ اُس کا استخوان و پوست اور خون و گوشت اسی کے مایۂ خمیر سے تیار ہوتا ہے۔ یہیں کی آب و ہوا میں اس کا نشو و نما ہوتا ہے۔ اسی کے مناظر سے اس کی آنکھیں آشنا اور لطف اندوز ہوتی ہیں۔ یہیں کے رہنے والے انسانوں کے ساتھ بچپن سے اس کے ربط و ضبط اور اُنسیت و الفت کا رشتہ مضبوط ہوتا ہے اور اسی سرزمین سے اس کے مادی اغراض و مفاد وابستہ ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس جذبۂ وطنیت کے خلاف اسلام جو ایک فطری مذہب ہے کسی طرح تعلیم نہیں دے سکتا۔ لیکن اسلام چونکہ تمام بنی نوع انسان کو ایک دائرۂ وحدت میں لانے کے لئے آیا ہے اور نوع انسان تمام اقصائے عالم میں پھیلے ہوئے ہیں اس لئے وہ ایک محدود و مخصوص وطنیت کو قائم رکھتے ہوئے تمام روئے زمین کو [illegible] مسلمانوں کا وطن قرار دیتا ہے اور یہ اسلام کی انتہائی وسعت نظر اور نوع انسان سے محبت کی دلیل ہے جو حقیقت میں نہایت قابل قدر ہے۔ اسلام وطنیت کے اس مفہوم کا حامی نہیں جو دورِ موجودہ میں پیدا ہوا ہے۔ جس کی بنا پر ایک زبردست طاقت دوسری کمزور طاقت کو تباہ و برباد اور پامال و زبوں حال کر دے۔ جس نے حبش کو ہڑپ کر لیا اور خدا جانے کتنے ممالک کو تہ و بالا کرے گا۔ اسلامی جذبۂ وطنیت کی غرض انسانی ہمدردی، بنی نوع کی فلاح و بہبود اور اہل وطن کی راحت رسانی ہے۔ بہرحال اسلام اپنی عالمگیر اور غیر محدود وطنیت کے نظریہ کے ساتھ ہی ساتھ مخصوص وطنیت کو بھی جائز رکھتا اور مستحسن سمجھتا ہے۔ اسی بنا پر مسلمانانِ عالم میں یہ جذبہ ہمیشہ موجزن رہا ہے اور رہے گا۔ عربی کے اس زریں مقولہ نے تو روایت کی حیثیت اختیار کر لی ہے کہ

حب الوطن من الایمان

ترجمہ:۔ وطن کی محبت ایمان کی علامت ہے۔

تعلق قوی تر ہونگے اتنی ہی ہمدردی زیادہ ہوگی - مثلاً مذہب و نسل کی یکسانیت یا معتقدات کی ہم رنگی وغیرہ - لیکن خواہ یہ جذبہ محدود ہو یا وسیع، اگر یہ جذبہ اس بڑے جذبۂ ہمدردی نوع انسان کے ماتحت ہے تو یہ ہمیشہ ہمدردی سے مماثل رہیگا - اور اس جذبہ کا کبھی یہ اثر نہ ہوگا کہ اپنے وطن کی خاطر دوسرے قوم و ملک پر ظلم و تشدد روا رکھے - بلکہ جس قوم پر مصیبت ہوگی اس جذبہ کے زیر اثر انسان اس وطن کی مصیبت پر آنسو بہانے کے لئے مجبور ہوگا اور گو اپنے وطن کے برابر نہیں اس دوسرے ملک کی مصیبت پر بھی اُسے ضرور رنج و ملال ہوگا - شیخ سعدی نے اس جذبہ کی تفسیر و تشریح یوں کی ہے ؎

چیست انسانی ؟ تپیدن از تپ ہمسائگاں
ورنہ موم نخجد در باغ عدن پرناں شدن

اسلام کا دائرہ ہمدردی تمام عالم انسانیت پر حاوی ہے لیکن اس جذبے کے ماتحت ہمدردی کے جتنے مدارج ہیں اُن سب کو روا رکھنا اور مستحسن سمجھنا ہے - تمام دنیا کے ہادی و رہنما پیغمبر اسلام علیہ السلام نے باوجود اس کے کہ عجمی و عربی اور سیاہ و سفید کے فرق کو مٹا دیا - اور تمام عالم کو اسلام کا وطن قرار دیا لیکن مکہ معظمہ جو آپ کا اس دنیا میں مادی وطن ہے اس کی محبت آپ کو تمام مقامات عالم سے زیادہ تھی - چنانچہ بعض احادیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے - ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلعم نے مکہ معظمہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا - "اے کہ تجھ سے پاکیزہ ترین شہر کوئی نہیں اور نہ کوئی شہر تجھ سے زیادہ مجھے محبوب ہے - اگر میری قوم مجھے یہاں سے نکال نہ دیتی تو میں تیرے سوا اور کہیں سکونت اختیار نہ کرتا" حدیث کے الفاظ یہ ہیں :-

عن ابن عباسؓ قال - قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لمکۃ ما اطیبک من بلد و احبک الی ولولا ان قومی اخرجونی منک ما سکنت غیرک - "ایک دوسری حدیث ہے کہ حضرت صلعم نے مکہ میں مقام حزورہ پر کھڑے ہوکر فرمایا " اے مکہ خدا کی قسم تو اللہ کی بہترین اور محبوب ترین سرزمین ہے" الفاظ حدیث اس طرح ہیں :- عن عبد اللہ بن عدی قال رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واقفاً علی الحزورۃ فقال (لمکۃ) واللہ انک لخیر ارض اللہ

واقعاتِ کربلا

دنیا میں انسانی عظمت و شہرت کے ساتھ حقیقت کا توازن بہت کم قائم رہ سکتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ جو شخصیتیں تقدس و عظمت اور قبول و شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جاتی ہیں۔ دنیا عموماً تاریخ و حقیقت سے زیادہ افسانہ و تخیل کے اندر انھیں ڈھونڈھنا چاہتی ہے۔ اسی لئے فن تاریخ کے ایک ممتاز بانی علامہ ابن خلدون کو یہ قاعدہ بنا دینا پڑا کہ جو واقعہ دنیا میں جس قدر زیادہ مقبول و مشہور ہوگا اتنا ہی زیادہ افسانہ سرائی اُسے اپنے حصار تخیل میں لے لیتی ہے۔ مغربی شاعر گوئٹے نے اس حقیقت کو دوسرے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے "انسان عظمت کی حقیقت کی انتہا یہ ہے کہ افسانہ بن جائے"۔

تاریخ اسلام میں حضرت امام حسینؓ کی شخصیت جو اہمیت رکھتی ہے محتاج بیان نہیں۔ جس واقعہ نے اسلام کی دینی سیاسی۔ اور اجتماعی تاریخ پر سب سے زیادہ گہرا اثر ڈالا ہے وہ ان کی شہادت کا عظیم واقعہ ہے۔ یا بقول مولانا محمد علی جوہر یوں کہوں تو کہا جائے گا:

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

چنانچہ یہ واقعہ بھی متذکرہ بالا اصول کے تاثر سے خالی نہیں اور آج بھی ایک محقق اس کی تفصیلات کی تفتیش کے لئے علم و عقل کے دریا میں غوطے لگانے پڑتے ہیں۔ میں اس موقع سے وقت میں کوشش کروں گا کہ چند سادہ الفاظ میں اس واقعہ کا ایک خاکہ آپ کے سامنے پیش کروں۔

ایک قدیم مسلمان شاعر کی مشہور رباعی ہے :-

حبِ وطن از ملکِ سلیماں خوشتر
خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر
یوسف کہ بہ مصر یاد شاہی میکرد
می گفت گدا بودن کنعاں خوشتر

اور یہی وہ جذبہ تھا جس نے حضرت علامہ اقبال مرحوم سے یہ کہنے کے بعد کہ ع

"مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

یہ کہلوا کر چھوڑا کہ ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

غرض اسلام کی وطنیت ایک ایسی اعلیٰ وطنیت ہے جس کی حد تک کسی قوم اور ملک کے جذبہ وطنیت کی رسائی نہیں۔ ایک مسلمان کا یہ بھی فرض ہے کہ ایک مخلصانہ جذبۂ وطنیت کے ماتحت اپنے خصوص وطن اور اہل وطن کی فلاح و بہبود، ترقی و آزادی، راحت و آرام میں مساعی حسنہ بروئے کار لائے اور سچی ہمدردی کا اظہار کرتا رہے ؎

؎ اس مسئلہ کا مختصر اشارہ مضمون "انسان کامل" میں بھی کیا جا چکا ہے مگر چونکہ یہ مسئلہ آجکل خاص طور پر زیر بحث ہے اس لئے یہ مناسب سمجھا گیا کہ علیحدہ تفصیل کے ساتھ اسپر بحث کی جائے۔

یت بٹھانے کے بعد شہر کی ناکہ بندی کرادی اور ہزار سواروں کا ایک دستہ حر کی ماتحتی میں حضرت
م حسینؓ کی تلاش کے لئے بھیجا کہا جاتا ہے کہ خلیفہ کا حکم تھا کہ یا تو اُن سے بیعت لو یا انھیں
ب قیدی کی طرح حاضر کرو۔ قادسیہ کے قریب جہاں امام حسینؓ پہنچے تھے حر کی فوج نمودار
ئی۔ ظہر کا وقت آگیا تھا۔ آپ نے پہلے ظہر کی نماز پڑھی پھر وہیں عصر کی نماز بھی ادا کی۔ نماز
ں آپ کے دشمنوں نے بھی آپ ہی کی اقتدا کی۔ سلام کے بعد آپ نے مختصر سی تقریر میں
ایا " اگر تم ہمیں ناپسند کرو، ہمارا حق نہ پہچانو اور تمھاری رائے اب اس کے خلاف ہو گئی ہو
تم نے مجھے اپنے خطوں میں لکھی اور قاصدوں کی زبانی پہنچائی تھی تو میں واپس چلے جانے
کے لئے بخوشی تیار ہوں"۔ حر نے کہا کہ ہمیں ایسے خطوں کا کوئی علم نہیں۔ تو آپ نے خطوط
کے ڈھیر بیگ سے نکال کر پیش کر دئے۔ راستے میں کئی اور مقامات پر بھی اپنے دوستوں اور
منوں کو مخاطب کیا اور خلافت کی اہمیت کو سمجھایا۔ حر آپ کے ساتھ برابر چلا آ رہا تھا اور
بار کہتا تھا " اے حسین اپنے معاملہ میں خدا کو یاد کیجئے، میں سچ کہتا ہوں کہ اگر آپ جنگ
ریں گے تو ضرور قتل کر ڈالے جائیں گے"۔ آپ نے غضبناک ہو کر فرمایا" تو مجھے موت سے ڈراتا
ہے، مرد کے لئے موت ذلت نہیں جبکہ اس کی نیک نیت ہو اور اسلام کی راہ میں جہاد کرنیوالا ہو"

سامضی وما بالموت عار علی الفتی
اذا ما ادای حقا وجاهد مسلما

صبح کے وقت کوفہ کی طرف سے ایک مسلح سوار آتا دکھائی دیا۔ اس نے حر کو سلام کر کے ابن زیاد
خط پیش کیا۔ خط کا مضمون یہ تھا "حسین کو کہیں ٹکنے نہ دو۔ وہ کھلے میدان کے سوا
ہیں اترنے نہ پائے۔ قلعہ بند یا شاداب مقام میں پڑاؤ نہ ڈال سکے۔ میرا یہ قاصد تمھارے
اتھ رہیگا اور دیکھتا رہیگا کہ تم کہاں تک میرے حکم کی تعمیل کرتے ہو۔ الامامۃ والسیاسۃ
ے مصنف کا خیال ہے کہ اس کے بعد حضرت امام حسین حر کی تجویز کے مطابق ایک غیر معروف
ستے سے روانہ ہوئے۔ حر کا رسالہ بھی ساتھ ہو لیا۔ تین چار دن کے بعد محرم کی دوسری تاریخ ۶۱ھ

اہل بیت اپنے تئیں خلافت کا زیادہ حقدار سمجھتے تھے۔ امیر معاویہ کی وفات کے بعد تختِ خلافت خالی ہوا۔ یزید بن معاویہ پہلے سے ولیعہد مقرر ہو چکا تھا۔ اس نے اپنی خلافت کا اعلان کر دیا اور حسین بن علی سے بیعت کا مطالبہ کیا۔

کوفہ والے جن کا وطن حضرت علیؓ کا دارالخلافہ رہ چکا تھا۔ دل میں یزید سے خوش نہ تھے۔ اسلئے انھوں نے حضرت حسینؓ کو لکھا کہ آپ تشریف لائیے۔ ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔ آپ نے اپنے چچیرے بھائی مسلم بن عقیل کو اہل کوفہ سے بیعت لینے کے لئے بھیجا اور خود بھی سفر کی تیاری شروع کی۔

امام حسینؓ کے دوستوں اور عزیزوں نے اس سفر کی مخالفت کی۔ عبداللہ بن جعفر آپ کے چچیرے بھائی نے مدینہ سے آپ کو ممانعت لکھی، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے خاص طور پر روکا اور کہا کہ لوگ آپ کے اس ارادے سے بہت پریشان ہیں مگر آپ ان باتوں سے متاثر نہ ہوئے اور اپنے ارادہ پر قائم رہے۔ ناچار اس پختگی عزم کو دیکھ کر ابن عباسؓ نے کہا کہ عورتوں اور بچوں کو تو ساتھ نہ لیجائیے، مجھے اندیشہ ہے کہ آپ ان کی آنکھوں کے سامنے قتل نہ کر ڈالے جائیں۔ آپ روانہ ہو گئے۔

راستہ میں مشہور شاعر فرزدق سے ملاقات ہوئی۔ آپ نے پوچھا تو نے لوگوں کو کس حال میں چھوڑا ہے۔ فرزدق نے جواب دیا، "اُن کے دل آپ کے ساتھ ہیں مگر تلواریں بنی امیہ کے ساتھ"

زرود میں پہنچ کر آپ کو معلوم ہوا کہ مسلم بن عقیل کو یزید کے گورنر ابن زیاد نے قتل کرا دیا۔ اس خبر کے سننے کے بعد آپ کے ساتھیوں نے آگے جانے سے روکا اور اصرار کیا کہ مکہ واپس چلئے۔ مگر آپ نے نہ مانا اور یہ کہا کہ میں دین کی حفاظت میں جان کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتا۔ یہاں پر میتھو آرنلڈ کا تبصرہ یاد آتا ہے۔ وہ اپنی قوم کو اسلام کی خصوصیات اور امام حسینؓ کے کیرکٹر کی طرف توجہ دلاتے ہوئے لکھتا ہے کہ میں نے بارہا کہا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی ذات میں دو برق وش قوتیں تھیں جن کو انکساری اور ایثار سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور یہی دو قوتیں ایک حد تک ہم امام حسینؓ میں بھی پاتے ہیں۔

ابن جریر لکھتا ہے کہ جب ابن زیاد کو امام حسینؓ کے آنے کی خبر ملی تو اس نے اہلِ کوفہ پر اپنی

یے میں جہاں چاہو چلے جاؤ مگر لوگ [illegible] سب کچھ قربان کر دیں گے۔ آپ کے
ساتھ ہو کر لڑیں گے۔ جو آپ پر گزرے گی وہی ہم پر بھی گزرے گی۔ آپ کے بعد خدا ہمیں زندہ نہ رکھے
پ نے تمام رات عبادت میں گزاری۔

جمعہ یا سنیچر کے دن دسویں محرم کو نماز فجر کے بعد عمر بن سعد اپنی فوج لے کر نکلا۔ حضرت حسینؑ
نے بھی اپنے اصحاب کی صفیں قائم کیں [illegible] وقت صرف ۳۲ سوار ۴۰ پیدل یعنی
ں ۷۲ آدمی تھے۔ میمنہ پر زہیر کو مقرر کیا، میسرہ حبیب کے سپرد کیا۔ علم اپنے بھائی عباسؑ کے ہاتھ
ں تھا۔ خیموں کے پیچھے خندق کھود کر بہت سے ایندھن [illegible] اور آگ جلا دی تاکہ دشمن پیچھے
سے حملہ آور نہ ہو سکیں۔

جب یزید کا [illegible] امام حسینؑ [illegible] آپ نے [illegible]
کوفیوں کو خطاب کر کے [illegible]
ھیں اب میرے قتل پر آمادہ ہو [illegible] ہو جاتی [illegible]
لوں نے انکار کیا۔ مگر امام کی سحر بیانی کا یہ اثر ہوا کہ [illegible] دشمن کی پارٹی سے آپ کی طرف آ گیا۔

اس واقعہ کے بعد عمر بن سعد نے [illegible] حسینؑ کی طرف [illegible]
کے بعد ابن سعد کے میمنہ نے حملہ کیا اور جب بالکل قریب پہنچ گئے تو حضرت [illegible]
اب کر کھڑے ہو گئے اور نیزے سیدھے کر دیئے اور تیر اندازی سے کتنے ہی آدمیوں کو زخمی اور ہلاک
کر دیا۔ اس وقت امام حسینؑ [illegible]
ے بعد عام حملہ شروع ہو گیا [illegible] بڑی شجاعت دکھائی [illegible]
[illegible] دشمنوں کی فوج کو حیران و منتشر [illegible] دشمنوں کی فوج [illegible]
[illegible] شہید کر دیے۔ حسینی میسرہ کے سردار [illegible]
[illegible] سردار زہیر آگے بڑھے اور وہ بھی شہید ہوئے۔ [illegible]
ں کے دو بھانجے عون و محمد ۱۳ یا ۱۴ برس کا بھتیجا قاسم ۱۶ برس کا بیٹا علی اکبر ۳۲ برس کا بھائی

کہ یہ قافلہ کربلا کے میدان میں پہنچ گیا۔ آپ نے فرمایا یہ کرب و بلا ہے۔ یہ مقام پانی سے دور تھا دریا میں اور اس میں ایک پہاڑی حائل تھی۔ ۷ محرم کو امام حسین نے ۲۰ مشکیزے اپنے خرچ کے لئے بھروا لئے۔

دوسرے دن ابن زیاد کا بھیجا ہوا لشکر عمر بن سعد کی سرکردگی میں کربلا پہنچا۔ اس فوج کی تعداد تقریباً چار ہزار تھی اس فوج نے راستے بند کر دئے اور امام حسین کو ان فوجوں کے حلقہ میں گھیر کر یزید کی بیعت پر اصرار کرنے لگا۔ یعقوبی لکھتا ہے کہ اسی دن شام کے وقت حضرت امام حسینؓ نے عمر بن سعد سے ملاقات کی اور تین شرطیں اس کے سامنے پیش کیں کہ ان میں سے کوئی ایک قبول کر لی جائے۔

اول: مجھے وہیں لوٹ جانے دو جہاں سے آیا ہوں۔

دوئم: مجھے خود یزید سے اپنا معاملہ طے کرنے دو۔

سوئم: مجھے مسلمانوں کی کسی سرحد پر بھیجو وہاں کے لوگوں پر جو گزرتی ہے وہی مجھ پر بھی گزرے گی۔

عمر بن سعد نے تینوں باتیں ابن زیاد کو لکھ کر بھیجیں مگر اس نے کوئی بات نہ مانی اور شمر کو بھیجا کہ عمر بن سعد سے کہدے کہ امام حسین سے یزید کی بیعت لے یا ان کا سر لائے۔ نماز عصر کے بعد عمر بن سعد نے اپنے لشکر کو حرکت دی جب قریب پہنچا تو حضرت عباسؓ بیس سواروں کے ساتھ نمودار ہوئے۔ عمر نے ان سے کہا کہ ابن زیاد کا جواب آ گیا ہے۔ جواب سنکر عباس واپس لوٹے اور حضرت امام حسین کو اس کی اطلاع دی۔

ابن جریر کے بیان کے مطابق ابن زیاد کا یہ حکم امام حسینؓ کو ۸ محرم کی شام کو سنایا گیا۔ امام نے اس پر غور کرنے کے لئے ایک شب کی مہلت مانگی۔ نماز مغرب کے بعد آپ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا کہ میں طے کر چکا ہوں کہ یزید کی بیعت کر کے اسلام کی تباہی میں شریک نہ ہوں گا۔ اب میرا ساتھ دینے میں تمہاری جانوں کا خطرہ ہے اس لئے میں بخوشی اجازت دیتا ہوں کہ رات کے

اشارے کو سمجھ جاتے اور آگے نہ بڑھتے لیکن بقول گبن ہر ملک و قوم کا سنگدل سے سنگدل انسان امام حسینؓ اور ان کے ہمراہیوں کے مصائب میں افسوس اور ہمدردی کا اظہار کرے گا۔

اعداء کا لشکر بقول ابن جریر و گبن پانچ ہزار رہا ہو یا بیس ہزار رہا ہو جیسا کہ مسعود حسن رضوی کا خیال ہے لیکن ۷۲ آدمیوں کا جو آپ کے کل ساتھی تھے۔ اس جم غفیر سے مقابلہ نہ ہو سکتا تھا نہ ہوا۔ شاید کوئی کہے کہ حکمت عملی کے اصول پر اس وقت خطرہ ٹالنے کے لئے بیعت ہی کیوں نہ کر لی مگر آپ کی آنکھوں کے سامنے اسلام کی عظمت کا سماں موجود تھا آپ نے اسلامی نبوت کے ہزاروں کارنامے دیکھے تھے جنہیں خود آپکے والد و جد کے عمل کا رنگ بھی شامل تھے آپ جانتے تھے کہ یزید کا انتخاب جمہوریت کے تحت نہیں ہوا جس کی بنیاد اسلام نے دنیا میں رکھی۔ آپ دیکھ رہے تھے کہ امیر معاویہ کے آنے کے بعد سے اسلام کے سارے اصولوں کا خاتمہ ہوتا جاتا تھا جس کو ہسٹری آف دی ورلڈ کے مصنف نے اس طرح بیان کیا ہے :-

"معاویہ کے عہد سے اس تعیش اور دبدبہ کا آغاز ہوا جو ہمیشہ سے مشرقی تزک و احتشام کے تخیلات کے ساتھ وابستہ ہے اور اسی کے عہد سے اس ضرب المثل نشان خلافت کی ابتداء ہوئی جس نے خلفاء راشدہ کی پاک اور سادہ زندگی کی جگہ لے لی۔"

اس سے ظاہر ہے کہ آپ سے اس کے سوا اور کوئی توقع نہیں ہو سکتی کہ آپ اپنے کو اسلام کے سچے اصولوں کے تحفظ کیلئے نذر کردیں اور وہ حیات حاصل کریں جس کے لئے کہا گیا ہے ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

عباس اور چند قریبی عزیز ایک ایک کر کے گئے اور اپنا جوہر شجاعت دکھا کر شہید ہو گئے۔

تاریخ کامل کا مصنف لکھتا ہے کہ اس کے بعد خود آپ پر ہر طرف سے وار شروع ہوا۔ آپ نے بھی تلوار چلانی شروع کی۔ پیدل فوج پر ٹوٹ پڑے اور تن تنہا اس کے قدم اکھاڑ دیئے۔ لڑائی کے دوران میں آپ کو سخت پیاس لگی۔ آپ پانی پینے کے لئے فرات کی طرف چلے ہی تھے کہ ایک تیر آیا اور آپ کے حلق میں پیوست ہو گیا۔ پھر آپ خیمہ کی طرف لوٹنے لگے تو زرعہ نے آپ کے بائیں ہاتھ کو زخمی کیا پھر شانے پر تلوار ماری۔ اس کے بعد ابن انس نے نیزہ مارا۔ آپ زمین پر گر پڑے تو اس نے آپ کا سر تن سے جدا کیا۔ پھر دشمن خیمہ کی طرف پڑھے۔ زین العابدین بستر بیمار پر پڑے تھے۔ شمر نے ان کے قتل کا حکم دیا۔ اسی اثنا میں عمر بن سعد آ گیا اور حکم دیا کہ کوئی عورتوں کے خیموں میں نہ گھسے۔

امام حسینؓ کا سر اور ان کے پسماندگان ابن زیاد کے سامنے پیش ہوئے۔ ابن زیاد حضرت حسینؓ کا سر اور پسماندگان کو مع خواتین اہل بیت ابن قیس کی نگرانی میں یزید کے پاس بھیجا اور تمام واقعات کی اطلاع دی۔ ابن جریر لکھتا ہے کہ یزید حضرت حسینؓ کا سر دیکھ کر رونے لگا اور کہا "ابن زیاد پر خدا کی لعنت، واللہ اگر میں وہاں ہوتا تو حسینؓ کو ہرگز قتل نہ کرتا اور ان کی شرطیں ضرور قبول کر لیتا"۔ اس نے حکم دیا کہ اہل بیت کے قیام کے لئے علیحدہ مکان کا انتظام کر دیا جائے۔ خواتین اہل بیت یزید کے محل میں پہنچائی گئیں۔ یزید کے خاندان کی عورتوں نے اور خاصکر ہند اس کی بیوی نے ان کو اس حال میں دیکھا تو بے اختیار رونے لگیں۔ یزید نے اہل بیت کو کچھ دن اپنا مہمان رکھا پھر ان لوگوں کو ایک معتبر آدمی اور فوج کی حفاظت میں مدینہ رخصت کر دیا۔ اس شخص نے راستے بھر ان لوگوں سے اچھا برتاؤ کیا۔

آج ہزاروں آدمی ابن عباس کو یاد کرتے اور کہتے ہیں کہ کاش امام حسینؓ ان کا مشورہ مان لیتے اور رک جاتے۔ آج صدہا اشخاص آپ کے ساتھیوں کے خلوص کی داد دیتے اور کہتے ہیں کہ کاش آپ ان کی سن لیتے اور فوراً واپس آ گئے ہوتے۔ آج ہم کہتے ہیں کہ کاش آپ فرزدق کے

"[illegible] اُن کی سادگی شاہان عالم کے شان و شوکت [illegible]"

یہ قرن یا دو قرن تک ہیں [illegible] کے بعد سے تو اسلامی حقیقت صرف جزو تاریخ بن کر [illegible] اصول جزو نظام بن گئے۔ سچائی کی جگہ [illegible] کا جسم لہرانے کا نشانیت [illegible] علیت بھی ان کو نہ [illegible]۔

[illegible]

تنظیم نہیں [illegible] چھوڑ [illegible]
ہیں۔ وہ وجہ ہے کہ مقابلہ [illegible]
[illegible] افتراق کا دامن تھا۔

حضرت امام حسن رضی نے ہر قسم کی ایوبی خواہشات [illegible] ترغیبات سے منھ موڑ کر مسلمانوں کو ایک بڑی کشمکش سے بچالیا۔ اس طرح [illegible]
کے خلاف سخت جوش پیدا ہوا۔ یزید [illegible]
استبدادیت پر ایک کاری ضرب لگی ان میں بھی [illegible]
اس وجہ سے [illegible] امام حسن کی [illegible]
اہل ایران میں جذبہ وطنیت پیدا کر دیا اور وہ [illegible]
سے اینٹ بجا دی اور عباسیوں کو [illegible]۔

انھوں نے اپنا درجہ [illegible]
کب تک ٹلتی۔ کربلا کے واقعات ہونے کو تھے اور موت [illegible] سے انکار نہیں ہوسکتا کہ امام حسین رضی کوفہ گئے مع اپنے خاندان [illegible] کے

واقعہ کربلا کی اہمیت

شخصی نظامِ سلطنت کی تاریخ سے جب ورق کو پلٹو گرد و پیش خرابیوں اور خود غرضیوں کی مثالوں سے بھرا ہوا نظر آتا ہے۔ پچھلی ہستی کے ہر گوشہ میں نظر ڈالو شخصیت و استبداد کے ایسے لرزہ خیز و المناک مناظر دکھائی دیتے ہیں جو تہذیب و شرافت اور فطری آزادی کے لئے سم قاتل ہی نہیں بلکہ انسانیت سوز ہیں۔

دنیا کے بڑے بڑے انبیاء و مصلحین بھی ان خرابیوں کو دور کرنے کے لئے آئے مگر انکا سد باب نہ ہو سکا۔ اسلام جس وقت دنیا میں آیا تو شخصیت و استبدادیت کی ظلمت صرف ریاستوں اور حکومتوں پر ہی مسلط نہیں تھی بلکہ ہر شخص جس کو غلبہ و طاقت سے کچھ بھی امتیاز و تفوق حاصل تھا وہ اس کے ناجائز استعمال سے پوری طرح شغف رکھتا تھا۔ خود پرست انسانی پتلے اپنے ایک خیالات کی پیروی اور اپنی تکمیل اور ناجائز خواہشوں کی تکمیل کے لئے اپنے ماتحتوں اور عوام الناس کو مجبور و پابند کئے ہوئے تھے۔ ضعیف و کمزور انسان استبدادیت کے ان بتوں کی پرستش کے لئے مجبور تھے۔ اسلام نے اس چیز کو شدت سے محسوس کیا اور استقلال و پامردی کے ساتھ ان کو مٹانے کی عملی کوشش کی۔ فرزند رسول کا یہ جہاد سعید اس حقیقت کا روشن ترین آئینہ ہے۔

جمہوریت کا جو نظام، آزادی ضمیر و رائے کا جو نظریہ، اخوت و مساوات کا جو راز ہمیشہ اسلام نے پیش کیا ہے۔ اس کی برتری کا غیر قوموں کو بھی اعتراف ہے۔

دین اسلام کے فرائض اور سنن کا ذکر کرتے ہوئے کہا جاتا ہے :-

ہیں کہ جس وقت امام حسینؓ نے کوفہ جانے کا ارادہ کیا تو آپ کے چچازاد بھائی عبداللہ بن جعفرؓ نے مدینہ سے ممانعت لکھی، ابن عباسؓ نے خاص طور پر روکا مگر آپ نہ رُکے۔ روانگی کے بعد بھی راستے میں مشہور شاعر فرزدق ملا اور اس نے کوفہ کے حالات پر ایک جملہ میں کافی روشنی ڈال دی تھی۔ اُس نے آپ کے سوال پر یہ کہا تھا کہ کوفہ والوں کے دل آپ کے ساتھ ہیں مگر تلواریں بنی امیہ کے ساتھ۔ پھر زرود کے مقام پر آپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ آپ کے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل جن کو آپ نے اہل کوفہ سے بیعت لینے کے لئے بطور مقدمۃ الجیش کے بھیجا تھا وہ قتل کر ڈالے گئے تو اگر اس واقعہ کا نتیجہ اور مقصد صرف رونا اور رُلانا ہی ہوتا تو آپ شام کی طرف جاتے ہی نہیں یا راستہ سے واپس آجاتے۔ لیکن خدا کو تو اس واقعہ سے ہمارے دلوں میں اسلام کی عظمت جاگزیں کرنا تھی۔ ہم میں عزم و استقلال پیدا کرنا تھا اور ہمیں یہ بتانا تھا کہ اسلامی اصول کے تحفظ میں اسلام دُنیا کی قربانی نہیں چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ ہم اس کی حُرمت قائم رکھنے کے لئے یہ پڑھتے ہوئے آگے بڑھیں کہ ؎

خوردۂ جاں بکف از بہر نثار آمدہ ام

اگر ہم اس حقیقت کو سمجھ جائیں تو رونے رُلانے کے بجائے اپنے دلوں میں ایک ایسا سچا جذبہ پیدا کریں گے کہ جس سے وہ پیرٹ Pharus جو حضرت امام حسین کو کربلا لے گئی ہماری شاہراہ عمل بن جائے گی۔

مسلم پر وہ سب ظلم و تعدی کا شکار ہوئے۔ امیر علی نے سچ کہا ہے کہ امام حسینؓ کی شہادتِ عظمیٰ نے ... عالم میں ایک سیبت ناک سنسنی پھیلا دی۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ حق کی حمایت اور اصول کی حفاظت کے لئے اکثر سچی قربانیاں کی گئی ہیں اور ان سے غیر معمولی نتائج مترتب ہوئے ہیں۔ سقراط نے توہم اور باطل پرستی کو مٹانے کے لئے زندگی کی کوئی حقیقت نہ سمجھی اور زہر کا پیالہ پی کر سچائی کی ضیا کو قائم و مستحکم کیا اور تمام عالم کو اپنے اصول کا گرویدہ بنا دیا۔ حضرت عیسیٰ پر یہودیوں نے جو ظلم و ستم ڈھائے یہ انھیں کا نتیجہ ہے کہ عیسائیت نے آج دنیا کے وسیع خطہ کو گھیر لیا ہے۔ کربلا کی سفاکیوں نے بھی اسلامی تاریخ کو بدل دیا تیرہ سو برس کے اندر تیرہ سو محرم گذر چکے اور ہر محرم اس حادثہ کی یاد تازہ کرتا رہا۔ امام حسینؓ کے جسم سے دشتِ کربلا میں جس قدر خون بہا تھا اس کے ایک ایک قطرہ کے بدلے دنیا اشک ہائے ماتم و الم کا ایک ایک سیلاب بہا چکی ہے۔ اور آج بھی ہماری زبانوں پر وہ اشعار ہیں جو حضرت عقیل بن ابی طالب کی صاحبزادی اس واقعہ کے بعد پڑھا کرتی تھیں۔

مَاذَا تَقُوْلُوْنَ اِنْ قَالَ النَّبِیُّ لَکُمْ

مَاذَا فَعَلْتُمْ وَاَنْتُمْ اٰخِرُ الْاُمَمِ

بِعِتْرَتِیْ وَبِاَهْلِیْ بَعْدَ مُفْتَقِدِیْ

مِنْهُمْ اُسَارٰی وَمِنْهُمْ ضُرِّجُوْا بِدَمِ

ترجمہ: ۔ کیا کہو گے جب نبی کریمؐ تم سے سوال کریں گے کہ اے وہ جو سب سے آخری امت ہو تم نے میری اولاد اور خاندان سے میرے بعد یہ کیا سلوک کیا کہ ان میں سے بعض قیدی ہیں اور بعض خون میں نہائے پڑے ہیں۔

اس واقعہ سے ہمیں بہت سے سبق ملتے ہیں لیکن ہم دس دن آپکے اپکے دنیا کی کے اصول پر عمل کر کے بھول جاتے ہیں۔ ہم اس واقعہ کی تاریخ صحیح طور پر نہیں پڑھتے ورنہ ہم کو معلوم ہو جاتا کہ یہ واقعہ صرف رونے اور رلانے کا نہیں ہے بلکہ سبق حاصل کرنے کا ہے۔ آپ جانتے

نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس دور میں عورت سے بڑا طبقہ یعنی مرد طبقہ عورت کے [illegible]
کنفیوشس کے اس قول سے ہوتا ہے۔ عورت کا جو قدر مرتبہ [illegible]
کے بس میں بھی نہیں رہتا۔ بودھ مذہب میں عورت کو ایک گھناؤنی چیز سمجھ کر اس سے بچنے
کی تلقین کی گئی تھی۔ یہی اسرائیل میں یہ حالت تھی کہ [illegible]
یہاں جو بچہ پیدا ہوتا وہ اسے [illegible]
بہت غمگین ہوتیں کہ اسے مقدس معبد میں کس طرح لے جائیں [illegible]
کی جو حالت تھی وہ سورۂ نحل میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ [illegible]
مِنْ سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ

(جب اس کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ غم و غصہ سے کالا پڑ جاتا ہے [illegible]
[illegible] اپنی قوم سے چھپنے کی کوشش کرتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ [illegible]
[illegible] اس لڑکی کو زندہ زمین میں گاڑ دے [illegible])

جس بچہ کو [illegible] لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ اسی طرح توریت سے ماخوذ
داستانوں میں عورت ایک ملکیت سمجھی جاتی تھی جو زمین و املاک کی طرح وراثت میں تقسیم ہوتی تھی۔

لیکن سب سے زیادہ بدحالی عورت کی ہندوستان میں تھی جہاں منوسمرتی کی رو سے عورت
کو ورکے [illegible] علم سے بھی محروم رکھا گیا تھا۔ وہ علم و شعور کی تمام خوبیوں سے خالی سمجھی جاتی تھی۔ اسے
رسمی مذہبی اعمال و نیکیاں بھی مرد سے وابستہ تھیں اور وراثت میں اس کے حقوق کا تو کوئی سوال
ہی نہ تھا۔ عورت کی عبادت صرف یہی تھی کہ وہ اپنے شوہر کی [illegible]
[illegible] ہندو عورت کی بیوگی کا [illegible] سے بڑا دردناک کردار ہے
[illegible] عورت کی بیوگی کا [illegible]
بیوگی ہے چنانچہ آج بھی ہندوستان میں یہ چیز مجبوری [illegible] شادی کے وقت [illegible]

اسلام اور عورت

اس وقت ہمارے ملک میں عورتوں کے قانونی حقوق معین کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں ممالک مغرب میں نسوانی مسئلہ ایک پیچیدہ شکل اختیار کئے ہوئے ہے۔ لیکن اسلام نے آج ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر اس مسئلہ کا مکمل ترین حل دنیا کے سامنے پیش کر دیا اور عورتوں کے حقوق تعین کر کے ایسی حدیں مقرر کر دیں جن کو ملحوظ رکھنے کے بعد کسی پیچیدگی کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ اور اسلام کے دیگر اصول کی طرح اس مسئلہ کا حل بھی مساوات کی بنیاد پر قائم ہے۔ اس لئے مرد عورت کسی کو وجہ شکایت نہیں پیدا ہو سکتی آج بدقسمتی سے مسلمانوں میں بھی مختلف تاثرات کے ماتحت یہ سوال مرکز سے ذرا ہٹ گیا ہے اس لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم قرآنی تعلیمات کے ماتحت ایک بار پھر حالات کا جائزہ لیں۔

لیکن قبل ازیں کہ میں عورت کی حیثیت اور حقوق کے بارے میں اسلامی نظریہ پیش کروں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ روشنی اس مسئلہ پر ڈالی جائے کہ اسلام سے پہلے دنیا میں عورت کی کیا حیثیت تھی نیز جدید تمدن نے اس معاملہ میں کس حد تک ترقی کی ہے تاریخ عالم پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہی سے مردوں نے اپنی جسمی قوت سے دنیا پر غلبہ پا کر عورت کو دبا لیا اور اسے اس قدر درماندہ کہ کبھی اسے ابھرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ جتنے معاشرت، اور تمدن کے اصول بنے وہ سب مردوں کے بنائے ہوئے تھے اس لئے مردوں کے موافق تھے اور جتنے قوانین مرتب ہوئے وہ عورت کی حیثیت گھٹانیوالے تھے۔ رومن تمدن جس کا آج راگ گایا جاتا ہے اس کے متعلق ڈرجل کہتا ہے کہ اس میں عورت کو متلون مزاج اور بدفطرت سمجھا جاتا تھا۔ یونانی تہذیب میں اپنے عروج کے زمانہ میں بھی عورت کو قابل اعتنا

غرضیکہ دورِ ماضی میں جو بندشیں عورتوں کے لئے کبھی گئی تھیں اور جس طرح مرد اپنے غلبہ سے انھیں محکوم و مظلوم بنائے ہوئے تھا اس کا اثر آج تک موجود ہے۔ مردوں کی معین کی ہوئی بندشوں کو توڑنے کی ضرورت کا احساس بھی ان میں پیدا نہ ہو سکا۔ بعض تبدیل مصلحین نے جب کبھی تھوڑی بہت تبدیلی اس صورت میں کی اور عورتوں کے حقوق کسی حد تک تسلیم کرنے پر آمادگی ظاہر کی تو اس پست حال و درماندہ صنف کی بے حسی نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اپنی بیڑیوں کو کاٹنے کے بجائے انھیں اور مضبوط کرتی رہی۔ بعینہٖ یہی صورت آج پست حال اقوام کی نظر آتی ہے جو اپنی پستی کو بلندی سے بدلنے کا خیال بھی دل میں لاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ اس لئے کہ صدیوں کی مظلومیت نے ان کے احساسات خود داری کو بالکل فنا کر دیا ہے اور اپنی اس حالت پر انھیں اس حد تک اطمینان ہو گیا کہ وہ اپنے کو اس سے بہتر حالت کا مستحق بھی نہیں سمجھتے۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو مجھے ضلع اعظم گڈھ میں پیش آیا۔ میں نے ایک چمار کو اس سے بلایا کہ اُسے پانی بھرنے پر ملازم رکھوں۔ لیکن جب میں نے اس سے اپنا ارادہ بیان کیا تو وہ حیرت سے میرا منھ دیکھنے لگا اور باوجود میرے سمجھانے کے اُسے کسی طرح یقین نہ آیا کہ میری حیثیت کا آدمی کیونکر اس کے ہاتھ کا پانی پی سکتا ہے۔ چنانچہ میرے اصرار کے باوجود وہ پھر نہیں آیا۔ اسی طرح اوائل دنیا سے آج تک ہر ملک اور ہر تمدن نے عورتوں کے ساتھ جو سلوک کیا اور جس طرح انھیں دبا کر رکھا اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان سے اس کا احساس بھی اٹھ جائے کہ فی الحقیقت ان کی حیثیت کیا ہے۔

اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ اس عالمگیر بدسلوکی کے مقابلہ میں اسلام نے عورت کے ساتھ کیا سلوک کیا اور کس طرح اس کی صدیوں کی بیڑیاں کاٹ کر پھینکدیں۔ اسلام کا سخت سے سخت دشمن بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی سب سے پہلا مذہب ہے۔ جس نے عورت کی حیثیت اور حقوق کا تعین کیا اور ان کو مذہب معاشرت۔ سیاست اور زندگی کے ہر شعبہ میں مردوں کے دوش بدوش لاکر کھڑا کر دیا۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ (اور مردوں کی طرح عورتوں کے بھی پسندیدہ حقوق ہیں) یہ تاریخ عالم کا سب سے پہلا مژدہ ہے جو جنسِ لطیف کو

کی جاتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ آج بھی ہندو عورت اپنے شوہر کا جھوٹا کھانا اپنے لئے باعثِ برکت سمجھتی ہے اور مرد جنس کا چھوٹا بچہ تک جب تک کھانا نہ کھا چکے اسوقت بھوکی بیٹھی رہے گی۔

"ہندوستان میں ہندو مذہب نے اس وقت تک عورتوں کو ملکیت کا حق نہیں دیا ان کے مرد قانون وراثت کی رو سے جو جائداد اپنے شوہر کی طرف سے یا کسی مرد کی طرف سے پائے۔ اس میں صرف حین حیاتی حق رکھتی ہے۔ نہ وہ اُسے رہن رکھ سکتی ہے نہ بیع اور اس کی آمدنی سے گذارہ کرنے کے سوا کوئی اور حق اُسے حاصل ہے۔ صرف تین قسم کی جائدادوں میں اُسے حق ملکیت دیا گیا ہے یعنی (۱) وہ غیر منقولہ جائداد جو اُسے جہیز میں ملے یا (۲) وہ جو اُس کے اعزہ سے تحفہ میں ملے یا (۳) وہ جائداد جو کسی عورت نے شادی سے قبل از خود پیدا کی ہو۔"

تاہم یہ امر باعثِ طمانیت ہے کہ ہندو قوم بیدار ہو رہی اور ہندو عورتوں میں اپنے حقوق کا احساس پیدا ہو چلا ہے۔

اب ہم اس خطۂ دنیا پر نظر ڈالتے ہیں جو آج ترقی و تمدن کا سب سے بڑا علمبردار ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان و فرانس و جرمنی کے قدیم قوانین وراثت میں عورت کا حصہ جائداد غیر منقولہ پر مطلق نہ تھا اور اینگلو سیکسن کے زمانہ میں یعنی آج سے صرف دو صدی پیشتر یہ محسوس کیا گیا کہ کسی حد بعض قیود کے ساتھ جائداد میں عورت کو حصہ دینے کی ضرورت ہے۔ ابھی ڈیڑھ سو سال پیشتر تک انگلستان میں عورت کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ اپنی طرف سے کوئی معاہدہ کر سکے۔ مغربی تمدن کے نشاۃ ثانیہ کے وقت عہد الزبتھ میں جبکہ وہاں کا تمدن اور سیاسی وقار اپنے اوج کمال پر تھا اس عہد کا آئینہ دار شکسپیر عورت کے متعلق کہتا ہے کہ "عورت! ایک نازک ترین شیطان ہے جسے کوئی آج تک سمجھ نہیں سکا" اسی ملک کا ایک متمدن شاعر بائرن کہتا ہے کہ "عورت قدرت کا ایک خوبصورت ترین عیب ہے"

آج بھی مغرب کی تمام ترقیوں کے باوجود شادی کے بعد عورت اپنے تمام حقوق ملکیت کھو بیٹھتی ہے اور اپنا خاندانی نام تک باقی نہیں رکھ سکتی بلکہ شوہر کے نام پر پکاری جاتی ہے۔

ارشاد ہے فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ اور دوسری جگہ لَا تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا۔ یہی کہا اور اس طرح جو رسم اُس وقت جاری تھی کہ نکاح میں عورت کی رضامندی ضروری نہیں سمجھی جاتی تھی اُس کی بیخ کنی کردی۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ قرون اولےٰ میں ہر نکاح کے وقت اس کا خاص التزام ہوتا تھا کہ پہلے سے فریقین اچھی طرح ایک دوسرے کو دیکھ بھال لیتے تھے اور اپنی رضامندی ظاہر کر دیتے تھے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ المغیرہ ابن شعبہ نے جب شادی کرنی چاہی تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا کہ تم نے لڑکی کو دیکھا ہے۔ المغیرہؓ نے کہا کہ نہیں تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تمہیں شادی سے پہلے لڑکی کو ضرور دیکھ لینا چاہیئے۔

اسی طرح طلاق کے معاملہ میں بھی مرد و عورت دونوں کا پلہ برابر رکھا۔ آج مغربی قانون میں طلاق اور علیحدگی دو چیزیں رائج ہیں۔ طلاق کے لئے عورت کی بدچلنی کا ثبوت پیش کرنا ضروری ہے۔ اس لئے باہمی اختلاف کی صورت میں عموماً علیحدگی حاصل کی جاتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ میاں بیوی الگ الگ رہیں اور ان میں سے کوئی دوسری شادی نہ کر سکے۔ اس صورت حال کی خرابیاں بہ آسانی قیاس کی جا سکتی ہیں۔ اس کے برعکس اسلام نے محض اختلاف مزاج کے عذر کو بھی طلاق کے لئے جائز تسلیم کر لیا اور مرد و عورت دونوں کو برابر اس کا حق دیا کہ جب آپس کی مخالفت ناقابل برداشت حد تک پہنچ جائے تو وہ طلاق حاصل کر سکتے ہیں اور دیگر جن وجوہ کی بنا پر طلاق حاصل کی جا سکتی ہے۔ ان میں بھی دونوں کو برابر کا حق ہے چنانچہ قرآن پاک میں ہے کہ:۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ط

اس کی تائید اس حدیث شریف سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت ثابتؓ ابن قیس کی بیوی جمیلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور کہا کہ میں اپنے شوہر کو طلاق دینا چاہتی ہوں۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ کیوں؟ تو کہا کہ بنتی نہیں ہے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا حیل و حجت طلاق کی کارروائی کرا دی۔ اسی حدیث میں بی بی جمیلہؓ کے یہ الفاظ بھی موجود ہیں کہ مَا اَعِيْبُ عَلَيْهِ فِيْ خُلُقٍ وَّلَا دِيْنٍ ط یعنی میں نہ اس کے اخلاق پر عیب لگاتی ہوں نہ اس کے دین پر۔

سنایا گیا اور لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ط میں پھر اس کی توثیق کیگئی اسی کے ساتھ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ط کہہ کر مرد و عورت کے مساوی تعلقات قائم کئے۔ عورت کو اپنی ماں کی طرف سے اپنے باپ کی طرف سے اور اپنے شوہر کی طرف سے ترکہ کا مستقل حق ملکیت دیا گیا اور اس ملکیت پر کسی قسم کے قیود نہیں عائد کئے گئے۔ افسوس ہے کہ پنجاب کے اور بعض دیگر جگہ کے مسلمانوں نے اس اسلامی قانون کو ٹھکرا دیا ہے اور عورتوں کے حقوق کو پامال کر رکھا ہے مگر مجھے امید ہے کہ وہ وقت جلد آئے گا جبکہ عورتیں اپنے ان حقوق کو کونسلوں اور اسمبلیوں میں آکر حاصل کر لینگی۔

عورت کی حیثیت کو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں دیکھا جائے تو پیدائش سے لے کر موت تک زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس میں اُسے مرد سے کم درجہ کی حیثیت دی گئی ہو۔ سب سے پہلے پیدائش کے وقت جو لڑکی پیدا ہونے پر اظہار غم کیا جاتا تھا۔ اُسے اس طرح دور کیا کہ لڑکی اور لڑکے کے امتیاز کو یہ کہکر مٹا دیا کہ يَهَبُ لِمَن يَشَاءُ إِنَاثًا وَيَهَبُ لِمَن يَشَاءُ الذُّكُورَ ط اور پھر فرمایا کہ وَجَعَلَنَاكُمْ ذُكْرَانًا وَأُنثَىٰ ط جس سے صاف صاف ظاہر کر دیا کہ پیدائش کے اعتبار سے لڑکے اور لڑکی دونوں یکساں ہیں۔ افسوس ہے کہ ہندوؤں کی تقلید میں مسلمانوں نے اس اسلامی نظریہ کو ترک کر دیا اور آج ہندوستانی مسلمان بھی لڑکیوں کی پیدائش پر اتنا خوش نہیں ہوتے جتنا لڑکے کی پیدائش پر۔

اسی طرح وراثت اور ترکہ میں جس طرح لڑکے کا حق مقرر کیا۔ اسی طرح لڑکی کا بھی باپ کی جائداد میں بیٹی کا حصہ جو کم رکھا اس کی تلافی شوہر کی جائداد سے حصہ دلا کر کر دی اور یوں بھی شوہر کو تمام اخراجات کا کفیل بنا کر باپ کی جائداد میں سے حصہ کی کمی کی تلافی ہو جاتی تھی۔

نکاح آج تک دنیا کی تمام اقوام میں محض ایک رسم ہے۔ لیکن اسلام نے سب سے پہلے اسے معاہدے کی شکل دی اور اس میں معاہدے کے تمام شرائط لازم کئے۔ ظاہر بات ہے کہ معاہدہ برابر والوں ہی میں ہوتا ہے۔ اس لئے نکاح کی اسلامی حیثیت مرد و عورت کے مساوات کی بیّن ترین دلیل ہے شوہر اور بیوی کے انتخاب میں بھی اسی طرح فریقین کے حقوق و اختیارات مساوی رکھے گئے ہیں چنانچہ

اس کے بعد پھر عورت پر تہمت لگانے والوں کی جو سزا مقرر کیگئی ہے اور جس کے مستحق میرے نزدیک آج ہم سب قریب قریب سارے ہندوستان کے مسلمان ہیں وہ سخت عبرت انگیز ہے یعنی اسّی دُرّے بھی مجمع عام میں لگائے جائیں اور پھر کبھی ایسے شخص کی شہادت نہ قبول کی جائے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ (النور ۴)

بدچلنی کی شہادت بلا چار گواہوں کے نہیں مانی جاتی اور اگر گواہ نہ ہوں صرف قسم پر انحصار ہو تو مرد کی قسم سے زیادہ عورت کی قسم کو وزن دیا گیا ہے۔ یعنی ایک ہی طرح کی دو قسموں پر عورت کو سزا نہیں دلائی۔ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ الخ

فی الحقیقت اسلام عورت کو مرد کی رفیقۂ حیات قرار دیتا ہے۔ چنانچہ عورت کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید متعدد آیات قرآنی اور احادیث نبوی میں موجود ہے۔ سورہ روم میں بیویوں کی تخلیق کی غایت یہ بتائی کہ مرد ان کی طرف مائل ہوں اور ان سے محبت کریں خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِنِسَآئِهٖ میں اسی اصول کی توضیح ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے شہرہ آفاق خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا کہ "اے مردو! تم عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈرتے رہو اور بہت احتیاط برتا کرو۔ اس لئے کہ وہ خدا کی امانتیں ہیں" اس کے بعد جہاں جہاں عورتوں کے حقوق کا ذکر کیا وہاں ان حدود کی بھی تاکید کی اور ان میں تغیر و تبدل کرنے والوں کو عذاب الٰہی سے ڈرایا۔

ایک اعتراض یہ کیا جا سکتا ہے کہ تعدد ازدواج کی اجازت میں عورت کی تنقیص کا شائبہ پایا جاتا ہے لیکن اس اجازت کی نوعیت اور قیود سے قطع نظر صرف یہ بات کہ عورت بہ نکاح و طلاق میں کوئی جبر نہیں ہے۔ اس اعتراض کو رد کر دیتی ہے۔ جو عورت شادی شدہ شخص سے تعلق نہ کرنا چاہے وہ اپنے فعل کی مختار ہے اور شادی کے بعد اگر مرد دوسرا نکاح کرنا چاہے تو پہلی بیوی اسے ناپسند کرنے کی صورت میں طلاق لے سکتی ہے۔ اب رہی یہ بات کہ ایسی اجازت کیوں دی گئی اس کے دو سبب ہیں۔ اول تو یہ کہ عورت کی بعض قدرتی ذمہ داریاں ایسی ہوتی ہیں۔ مثلاً حاملہ ہونے کی صورت میں کہ ان کی وجہ سے اخلاقی قیود

قابل اصلاح مخالفت کو رفع کرنے کے لئے جو پنچایت مقرر کرنے کا حکم دیا گیا اس میں ایک پنچ مرد کی جانب سے اور ایک عورت کی جانب سے رکھا گیا تاکہ دونوں کی سماوی حیثیت میں کوئی امتیاز نہ رہے۔
وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ط میں خلع کے مسئلہ پر اس وقت بحث نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن جو لوگ اس مسئلہ کے قائل ہیں وہ بھی مانتے ہیں کہ جب معاہدہ عقد تحریری ہو تو مرد و عورت دونوں کے حقوق برابر ہیں۔

اسی طرح بدچلنی کی سزا میں بھی مرد اور عورت کو یکساں رکھا۔ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ط اور اعمال نیک کی جزا میں بھی ایک کو دوسرے پر فوقیت نہیں دی اور نہ کسی جگہ ایک کے مقابلہ میں دوسرے کو نظر انداز کیا جیسا کہ الاعراف کی مشہور آیۃ۔ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ الخ سے ظاہر ہے۔ اس سے صاف ثابت ہے کہ یہ عقیدہ نہایت ہی فاسد ہے کہ دین میں مرد تو درجات عالیہ حاصل کر سکتے ہیں مگر عورتیں اس سے محروم رکھی گئی ہیں۔

بدچلنی کی حالت میں یہ لازمی نہیں رکھا کہ مرد ضرور ہی اپنی بیوی کو طلاق دیدے بلکہ ایک وہ صورت بھی رکھی جو آج ہندوستان میں ہم نے تمام مسلمان بیویوں کی کر رکھی ہے یعنی گھروں میں بند کر دینا۔ جیسا کہ ارشاد ہے:۔

وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ج فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ط

اور تمہاری عورتوں میں سے جو بدچلنی کا ارتکاب کریں تو اپنے میں سے چار گواہ ان پر بلا ذو سو آزردہ گواہی دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ ان کو موت لے جائے یا اللہ ان کے لئے کوئی راہ نکال دے۔ (النساء)

راہ نکالنے کا مفہوم مفسرین نے یہ بتایا ہے کہ ان کا جائز طور پر عقد ہو جائے۔ یا یہ توبہ کر لیں۔

سے عین مقتضائے فطرت ہے۔ لیکن اس سے عورت پر مرد کی فضیلت کسی طرح عاید نہیں ہوتی۔ علاوہ بریں نظام معاشرت اگر مناسب اصول پر رہے تو عورت کی کفالت مرد پر لازم رہے گی۔ لیکن مرد و عورت کے قوائے ذہنی اور دل و دماغ کی یکسانیت اس کی متقاضی ہے کہ دونوں کے حقوق میں مساوات ہو۔ فلسفہ وراثت کے اصول بتاتے ہیں کہ ہر پیدا ہونے والے بچہ میں کچھ خصوصیات ماں کی اور کچھ باپ کی ہونا لازمی ہیں اس لئے کہ اس کے نطفہ میں دونوں کا حصہ ہے۔ چنانچہ بچے کی نشوونما اور ترقی کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ماں اور باپ دونوں ذہنی اور جسمانی خوبیوں کے حامل ہوں۔ مرد و عورت کی قدرتی مساوات کا اس سے بھی اظہار ہوتا ہے کہ مرد میں کچھ عورت کا جزو ہے اور ہر عورت میں مرد کا جزو ہے۔ دونوں کی خلقت کا انداز قدرتی بتاتا ہے کہ عورت مرد کی ہم جلیس اور رفیقۂ حیات ہے اور یہی رتبہ اسلام نے اسکو دیا اور تمام مذاہب اور رسوم قدیمہ کے برخلاف عورت و مرد کے حقوق برابر کر دیئے۔ تعلیم میں اسلام کا حکم مردوں اور عورتوں کیلئے یکساں ہیں۔ قرآن حکیم کی آیت "عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ" میں لفظ انسان کا اطلاق عورت مرد دونوں کی شمولیت پر دال ہے۔ جبکی تائید حدیث نبی کریمؐ کے ارشاد "طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَۃٍ" سے بخوبی ہو جاتی ہے اسلام کے مبارک قرون اولیٰ کا عمل اسی مفہوم کے مطابق تھا۔ ہارون الرشید و مامون الرشید کے عہد میں بغداد دونوں جگہ عورتوں کی تعلیم اعلیٰ پیمانہ پر ہوتی تھی۔ لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ مساجد و مکاتب میں تعلیم پاتے تھے عورتوں کے لئے علیحدہ کالج بھی تھے اور ان میں عورتیں پروفیسر بھی ہوتی تھیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان خواتین علم و فضل تدبر، حسن انتظام، سیاست دانی اور رزم و بزم کے میدانوں میں مردوں کے دوش بدوش رہیں۔ اور اسلام کے قومی نظم و قوت میں دوہری جان پڑ گئی تھی۔ مگر آج مسلمان اپنی عورتوں کو گھروں میں بند کر کے ان تمام ترقیوں سے محروم ہو گئے۔ اس لئے کہ ان کی قومی زندگی کا ایک بازو ٹوٹ گیا ✦

کا اقتضا یہ ہے کہ کوئی اس قسم کی تدبیر جائز رکھی جائے۔ دوسرے یہ کہ مختلف تمدن اور مختلف ان نشو و نما کے درجات میں اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ مردوں اور عورتوں کی تعداد آبادی میں بہت تفاوت ہوتا ہے۔ ایسے تفاوت کی صورت میں اگر صرف ایک ہی نکاح کی پابندی فرض کی جائے تو باقیماندہ عورتوں کے اخلاقی تحفظ کی کیا صورت ہوگی۔ مثلاً خود انگلستان میں آج آئرلینڈ کو چھوڑ کر کل آبادی عورتوں ایک کروڑ نوے لاکھ ہے اور مردوں کی آبادی صرف ایک کروڑ ہے۔ ایسی صورت میں ان نوے لاکھ عو کی کیا حالت ہوگی۔ عاقلاں را اشارہ کافی است۔ لیکن اسلام نے تعدد ازدواج کی اجازت کیساتھ ایک زبردست قید عدل لگائی ہے جس ہر قسم کا عدل یعنی عدل اخلاقی، عدل معاشرتی، عدل معاشی، عدل حقوق نسوانی وغیرہ سب شامل ہیں یہ قید ایک ایسی قید ہے جس کو جواز کے پردے میں انسداد کی حکیمانہ تدبیر کہنا چاہیئے کیونکہ جذبات نفسانی کی تکمیل کیلئے تعدد ازدواج میں عدل ناممکن ہے۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ اسلام نے جس وقت تعدد ازدواج پر قیود وحدہ لگائیں تو اس وقت کسی اور مذہب یا تمدن کو اس کی جرأت بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس سلسلہ میں تنہا اسلام ہی خراج تحسین کا مستحق ہے۔ مگر اسلام بحیثیت عملی مذہب کے معاشرت کی مجبوریوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ان بدیہی شہادتوں کی موجودگی میں عورت کی حیثیت اور حقوق کسی شک و شبہ کے محتاج نہیں رہتے اور جس اسلامی تعلیم کا اس سے نمونہ ملتا ہے وہ اصول فطرت کے بالکل مطابق ہے اور اس لئے کہ مرد و عورت کے قوائے فطری میں اختلاف کے باوجود اُن کے قوائے ذہنی میں یکسانیت ہے اور اگر عورت کا مقصد محض مرد کے لئے بچے پیدا کرنا ہوتا تو قدرت اتنا اسراف نہ کرتی بلکہ حیوان کے شکل کی کوئی ہستی اس کے لئے بنا دیتی۔

اسی طرح اگر عورت کا فرض محض مرد کی خدمت ہوتا تو اُسے انسانی شکل دینے کے بجائے مشین کی سی شکل دیجا سکتی تھی۔ جو لوگ عورت کی حیثیت ادنےٰ بتلاتے ہیں وہ اس کی دلیل میں اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ کی آیت پیش کرتے ہیں۔ لیکن ایسے حضرات سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ قوامون سے مدعا حفاظت و کفالت کا ہے اور یہ ذمہ داری مردوں کے سر ڈالنا عورت کی قدرتی ساخت کے لحاظ

یہ رواج معترضین کا تختۂ مشق بنا ہوا ہے اور اعتراضات کی بھرمار دیکھ کر بعض جوشیلے ہندوستانیوں کو جو تاریخ سے نابلد تھے یہ ترغیب ہوئی کہ وہ اس سے اپنی قطعی بریت ظاہر کریں اور اسے خارجی اثرات کی پیداوار بتا کر سبکدوش ہو جائیں لیکن تاریخ جاننے والے تائید کریں گے کہ پردہ اپنی موجودہ شکل میں ہندوستان کی نہایت ہی قدیم رسم ہے اور یہی نہیں بلکہ اس شکل میں بعض دیگر ممالک میں بھی زمانۂ قدیم سے رائج رہا ہے۔ چنانچہ مسز فریڈ ایچ داس نے اپنی کتاب "پردہ" میں لکھا ہے کہ۔

"پردہ کی ابتداء انسانوں میں اعلیٰ اور ادنیٰ ذاتوں کی تقسیم سے ہوئی اور عورتوں کا چار دیواری میں بند رکھنا طبقۂ اعلیٰ کا طغرائے امتیاز بن گیا۔ ہندوستان کے معاشی مسائل کے ایک اور ماہر مسٹر این سی مہتا آئی سی ایس اپنی کتاب "ہندوستانی تمدن میں اسلام کا حصہ" میں فرماتے ہیں کہ "یہ غلط ہے کہ ہندوستان میں پردہ اسلام کے ساتھ آیا۔ عورتوں کو چار دیواری میں بند رکھنے کا رواج تمام قدیم اقوام میں پایا جاتا ہے اور خاص کر یہ ہندوستان میں تمدن قدیم کے ابتدائی زمانوں سے طبقۂ اعلیٰ میں موجود تھا۔ ہندوستانی مسلمانوں نے اس ملک سے رواج کو فقط اپنا لیا اور یہاں جو چیز نشانِ شرافت سمجھی جاتی تھی اسے اپنے یہاں بھی رائج کر دیا قدیم ہندو معاشرت میں پردہ کی مختلف دور زمانہ کے ساتھ بڑھتی گئیں اور منوشاستر نے عورتوں کی بیوفائی نے تخیل کو تقویت دے کر ان قیود کو اور سخت کر دیا۔ اس دستور کے ماتحت عورتوں کو صرف سوئمبر یا شادی بیاہ کے موقعہ پر گھر سے باہر نکلنے کی اجازت تھی۔

مستند ہندو کتب مقدسہ و تاریخ قدیم کی حسب ذیل روایات و تخیلات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ملک میں پردہ کی رسم آریوں کی آمد کے وقت سے رائج تھی یہ [illegible] کتابوں سے لیتے ہیں جو ہر ہندو کے نزدیک [illegible] قدیم تمدن کے بارے میں مقدس و مستند ہیں یعنی رامائن و مہابھارت۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس قرن میں پردہ [illegible] قیود کے ساتھ رائج تھا جبکہ سیتا اور دروپدی جیسی خواتین یہ دعوے کرتی تھیں کہ [illegible] کے سوا کسی نے بھی نہیں دیکھا اور دیوتاؤں کی نظر بھی دوچند نہیں ہوتی۔

پردہ ہندوستان میں
اور اسلامی نقطۂ نظر

لفظی معنوں کے لحاظ سے تو پردہ صرف خلوت ہے اور یہ ایک ایسی چیز ہے جو ترقی یافتہ ممالک کی عورتوں میں بھی رائج ہے لیکن ہندوستان میں یہ رواج ذرا زیادہ سختی سے برتا جاتا ہے اور غالباً ذات پات کی طرح یہ اسی ملک کی خصوصیت ہے۔ اس ملک میں اس کی شکل یہ ہے کہ عورتوں کو مکان کی چار دیواری میں بند کر کے بیرونی دنیا کے مناظر سے بالکل محروم کر دیا جائے۔

ظاہر بات ہے کہ اس قسم کے قیود محض اعلیٰ طبقہ میں یا طبقہ اوسط کے ذرا بڑے آدمیوں میں رواج پذیر ہو سکتے ہیں اور ادنیٰ طبقہ کی عورتوں کی اقتصادی ضروریات ان قیود کی حامل نہیں ہو سکتی ہیں چنانچہ اس طبقہ میں پردہ کا رواج اتنی سختی سے کبھی نہیں رہا ہے۔ خارجی حیثیت سے اس پر نظر ڈالی جائے تو صاف ظاہر ہوگا کہ مغربی تمدن سے متصادم ہو کر یہ رواج رفتہ رفتہ فنا ہو رہا ہے اور اعلیٰ طبقہ کے لوگ اور طبقہ اوسط کے بڑے آدمی جو سب سے پہلے اس تمدن سے دوچار ہوئے۔ وہ اس کی آزاد روی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ رفتہ رفتہ نقطۂ نظر کی یہ تبدیلی اونچے طبقہ اور طبقہ اوسط کے بڑے آدمیوں میں عام طور پر نفوذ کرنے لگی۔ ڈولیوں اور پالکیوں کی جگہ موٹر کاروں اور زمانۂ حال کی دیگر سواریوں نے لی اور پردہ کلب اور پردہ پارٹیوں میں بھی یہی اثر جلوہ گر نظر آنے لگا۔ طبقۂ اوسط کے چھوٹے آدمی بھی اقتصادی تنگنائیوں سے مجبور ہو کر اسی رنگ میں رنگ گئے۔ اس لئے کہ انھیں اس کی ضرورت تھی کہ گھر کے مردوں کی آمدنی میں عورتیں بھی محنت کر کے اضافہ کریں۔ چنانچہ مغربی تمدن کے اثرات اور اقتصادی ضروریات نے مل کر پردہ کے رواج کی بنیادیں کھوکھلی کر دیں۔

کے ماموں راجہ منتی نے شہر میں ایک محل بنایا [illegible] جاؤں کو بنیا تو عورتوں کے لیے ایک ایسی جگہ بنائی جو ہو میں معلق معلوم ہوتی تھی [illegible] جالیاں [illegible] دیکھنے کے لیے لگائی گئی تھیں [illegible] دستور پردہ [illegible] صفحہ ۱۹

برطانوی [illegible] ۱۱ [illegible] ۲۳ میں بھی عورتوں کے [illegible] باہر نکلنے کی ممانعت کی گئی ہے اور [illegible] ہو جائیں گی کہ وہ اپنے بال سنوار کر [illegible] کا [illegible]

ان معلومات [illegible] لطیف [illegible] ہیں تو [illegible] بھی یہی صورت نظر آتی ہے [illegible] نقاب [illegible] عورت کی نشانی بنا لیا گیا ہے [illegible] عورت کے چہرہ [illegible] ایک قدیم ڈراسہ [illegible] نقاب کے [illegible] ہو گئی [illegible]

جب راجہ [illegible] نقاب [illegible] عام [illegible] کو برقعے [illegible] فقیروں کے [illegible]

اس پردہ [illegible]

ہے [illegible]

سے معاہدہ [illegible]

۱۹۱۵ صفحہ [illegible]

صفحات ۱۳۰ تا ۱۴۰

[illegible] کتاب [illegible] مطبوعہ لندن [illegible] میں اس پردہ کا ذکر [illegible]

جب رامچندر جی کے بن باس کے موقعہ پر سیتا جی گھر سے باہر نکلیں تو لوگوں میں سخت ہیجان برپا ہوا اور اپنی راجکماری کو بے پردہ دیکھ کر سب چلا اٹھے کہ کیا برا زمانہ آگیا ہے کہ سیتا جی کی جھلک دیوتا بھی نہیں دیکھ سکے تھے باہر آگئی ہیں اور بازاری نگاہوں کا سامنا کریں گی۔ (رامائن ایودھیا کانڈم سورج ۳۳۔ شلوک ۱۹۷)

رامائن کی ایک اور روایت میں بیان کیا گیا ہے جب رامچندر جی نے فتح لنکا کے بعد اپنی رانی سیتا کو دربار میں بلوایا تو رامچندر جی کے ساتھی مردوں کو ہٹانے لگے۔ اس پر رامچندر جی نے بحیثیت عالم ویدوشاستر کے فتوے دیا:۔ "سنو! غم کے موقعوں پر، مجبوریوں میں، لڑائیوں میں، سوئمبر کے وقت اور قربانیوں میں اور شادی کے موقع پر عورت کا سامنے آجانا اور مرد کی نگاہ اس پر پڑ جانا گناہ نہیں ہے۔ سیتا مصیبت زدہ ہے اور مجبوریوں میں گرفتار ہے۔ اس کے سامنے آنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ خاصکر جبکہ میں موجود ہوں" (رامائن یودھ کانڈم سورج ۱۱۴۔ شلوک ۹۴۲)

جب راجہ بھیشن سیتا جی کو گھر سے باہر لائے اور رامچندر جی کے دربار میں لئے جا رہے تھے تو سیتا جی بے پردگی کی شرم کے مارے جھکی جاتی تھیں اور قدم نہیں اٹھتا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے بدن میں اپنے کو چھپا رہی ہیں۔ (بحوالہ مذکور)

عورتوں کے گھر کے اندر بند رہنے کے ایسے ہی واقعات مہابھارت میں بھی درج ہیں اور ایک معنی خیز روایت یہ ہے کہ جب یدھشٹر اپنی رانی دروپدی کو جوئے میں ہار گیا اور دُریودھن نے دروپدی کو باہر لاکر ذلیل کرنا چاہا تو دروپدی نے رو کر کہا کہ "راجاؤں نے مجھے صرف سوئمبر کے وقت دیکھا تھا اس سے پہلے مجھے کسی نے نہیں دیکھا۔ ہوا اور سورج بھی مجھے نہ دیکھ پاتے تھے لیکن آج بدقسمتی سے مجھے غیر مردوں کے سامنے آنا پڑا۔ افسوس راجاؤں کے خاندان سے سناتن دھرم جاتا رہا۔ کوئی شریف آدمی اپنی بیوی کو غیر مردوں کے سامنے نہیں لاتا مگر افسوس کہ اب خاندانوں سے مذہب جاتا رہا۔ (مہابھارت شلوک ۴۔۵۔۸۔۹ سبھا پردہ ادھیا ۶۹)

پرانوں کے زمانہ میں بھی پردہ کی وہی سختی پائی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے۔ جب راجہ سری کرشن

یہاں پر یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ اسلام نے رسم پردہ پر کیا اثر ڈالا۔ عرب میں اسلام کے وقت نقاب کی بعض قسمیں رائج تھیں لیکن اسلام نے ان سب کو اٹھا دیا تاہم اظہار آرائش کے خلاف ہونے کی وجہ سے اس نے دو چیزوں کے استعمال کی ترغیب دی یعنی "جلباب" و "خمار"۔ اول الذکر ایک چادر تھی جو کپڑوں کے اوپر لپیٹ لی جاتی تھی اور آج بھی یہ ہندوستان میں رائج ہے خصوصاً کھری عورتیں باہر نکلتے وقت اوڑھتی ہیں۔ یہ عرب میں خاص کر شریف عورتوں کے لئے رائج کی گئی تھی تاکہ جب وہ باندیوں کے ساتھ رفع حاجت کے لئے باہر جائیں تو پہچان لی جائیں اور عام لوگ ان سے مذاق نہ کر سکیں۔ آخر الذکر اسی قسم کا ملبوس تھا جیسا آجکل پہنتی ہیں۔ اس میں چہرہ، ہاتھ اور پیر کھلے رہتے تھے۔ عورتوں کو آزادی سے باہر نکلنے کی اجازت تھی اور انھیں کبھی گھر کی چار دیواری میں مقید نہیں کیا گیا۔ انھیں صرف اتنا حکم تھا کہ نظر نیچی رکھیں اور زیبائش کا اظہار نہ کریں۔ قرآن شریف کی حسب ذیل آیات سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔

"مومن عورتوں سے کہو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں" (پارہ ۱۸، سورۃ ۲۴۔ رکوع ۳۱ آیتہ ۳۰) مومن عورتوں سے کہو کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں (پارہ ۱۸ سورۃ ۲۴۔ رکوع ۴ آیتہ ۳۱) یہی حکم اس جگہ مردوں کے لئے بھی ہے اور انھیں بھی اپنی نظریں نیچے رکھنے اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ مردوں اور عورتوں کے ساتھ یکساں سلوک کیا گیا ہے۔ اگر مردوں اور عورتوں کو آزادی سے باہر نکلنے اور ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت نہ ہوتی تو ان احکام کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ قرآن مجید کی ایک اور آیتہ سے بھی صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اسلام نے عورتوں کو چہرہ اور ہاتھ بند رکھنے کا ہرگز حکم نہیں دیا۔ اس آیتہ میں عورتوں کو "اپنی زیبائش چھپانے کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ کہہ دیا گیا ہے کہ یہ حکم جسم کے ان حصوں کے لئے نہیں جن کا کھلا رہنا ضروری ہے (پارہ ۸۔ سورۃ ۲۴۔ رکوع ۴ آیتہ ۳۱) یہاں ہر "زینت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اس کی تفسیر دو طرح کی جاتی ہے۔ اول تو زیورات اور دوسرے جسم کے وہ حصے جو موجب کشش اور جاذب نظر ہوں خصوصاً سینہ وغیرہ۔ ایک اور جگہ کہا گیا ہے کہ عورتوں کو زمین پر پیر اس طرح نہ رکھنا چاہیئے کہ جو زیور چھپے ہوئے ہوں وہ ظاہر ہو جائیں اور اس آیتہ میں بھی چونکہ زینت کا لفظ استعمال ہوا ہے اس لئے اس کی پہلی

اس سلسلہ میں یہ مناسب ہوگا کہ منوشاستر کے بعض خاص خاص دفعات کا بھی ذکر کر دیا جائے۔ جن سے عورتوں کی قیود میں اضافہ ہو گیا۔ منو کا خیال تھا کہ "جذبات آدمی کو بے قابو کر دیتے ہیں اور بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگ بھی ان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ہمیں اپنی ماں اور بہن اور لڑکی کے ساتھ بھی تنہائی میں نہ بیٹھنا چاہیئے (منوشاستر ادھیائے ۴ صفحہ ۹۴) اور انھوں نے یہ فتوے دیا ہے کہ مردوں کو چاہیئے کہ دن رات عورتوں کو قید میں رکھیں اس لئے کہ شرم، لحاظ، ایمانداری یا حیا کوئی چیز عورت کی عصمت کو نہیں بچا سکتی، صرف چاہنے والا نہ ملے تو بچی رہے گی۔ مسز فریڈا داس نے منوشاستر کے ماتحت عورتوں کی حالت کا اظہار اپنی کتاب "پردہ" کے صفحہ ۲۷ میں اس طرح کیا ہے کہ منوشاستر ہی کا یہ تباہ کن اثر تھا کہ ہندوستانی عورتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سخت جکڑ بندوں میں کس دی گئیں۔

یہی خاتون کتاب مذکورہ بالا کے صفحہ ۹۳ پر فرماتی ہیں کہ ہندوؤں کا قدیم اور قرون وسطیٰ کا لٹریچر عورتوں کی اخلاقی تحقیر سے بھرا پڑا ہے۔ "آپ مہلک زہر یا دریا کی طغیانی یا آندھی، یا خوبصورت طویل الجثہ خوفناک ہاتھی یا شکار کے بھوکے شیر یا فرشتہ موت یا چور وحشی قاتل پر بھروسہ کر سکتے ہیں لیکن اگر عورت پر بھروسہ کیا تو ذلت و خواری کے صحرا میں سرگرداں ہونا پڑے گا۔ اس سے لوگوں کے دماغ میں یہ بات جم گئی کہ عورتوں کو اگر گھر کے باہر پھرنے کی آزادی دی گئی تو ان کا رتبہ گھٹ جائے گا اور وہ نیچ ذات کی عورتوں کے برابر ہو جائیں گی۔

لیکن یہ خیالات صرف منو ہی کے نہ تھے بلکہ مختلف ممالک کے قدیم حکماء کے خیالات بھی اس معاملہ میں ایسے ہی تھے۔ چنانچہ سقراط کا قول ہے کہ "عورت سے زیادہ کوئی چیز دنیا میں باعث پریشانی نہیں ہے"۔ یونانیوں کا دراصل یہ عقیدہ تھا کہ سانپ کے زہر کا تو علاج ہو سکتا ہے مگر عورت کی بدکاری ناقابل علاج ہے۔ دمشق کے پادری جان کا خیال تھا کہ "عورت بدکاری کی پیداوار اور امن کی دشمن ہے"۔

برعکس اس کے اسلام نے عورت کو رفیق زندگی تسلیم کیا اور اُسے معاہدہ کرنے کا اختیار اور شوہر، ماں اور دیگر اعزہ کی جائیداد منقولہ و غیر منقولہ میں حصہ پانے کا حق دیا۔

باغ کے مقام پر یا مدینہ منورہ کے قریب [illegible] سے قریب کے ایک مکان میں قیام کرایا گیا تھا۔ اس مکان میں تین تنہا ایک نا محرم تھا [illegible] ابو طیب کا خیمہ مقدمہ لیا اور سمجھ نے کی اجازت دی۔ دونوں میں بات چیت شروع ہوئی [illegible] کے ہونٹوں سے موتیوں کی طرح الفاظ جھڑتے گئے۔ اس گفتگو کے دوران میں بڑی [illegible] سے تو بیٹھ گئی اور ہنس کر ابو طیب سے کہا کہ اس حسین [illegible] کی مکاری سے بچتے رہنا۔

اسلامی تاریخ عورتوں کے علم و فضل، تصنیفات و [illegible] و بلاغت کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ام البنین زوجہ ولید اول دمشقیہ [illegible] اپنے عہد کی نہایت ہی ممتاز خاتون تھیں انھوں نے حجاج ابن یوسف کے سامنے ایک معرکہ آرا تقریر کی اور حجاج کو برا بھلا کہا۔ سکینہ بنت امام حسین علیہ السلام اپنے عہد کی خواتین میں بلحاظ اپنے خاندان و حسن و جمال [illegible] کے [illegible] جاتی تھیں۔ ان کے [illegible] کا [illegible]

[illegible] عورت کی زندگی [illegible] نہیں تھا [illegible] بعد عورتوں میں کچھ پردہ کا رواج خصوصاً ایرانیوں کے اثر سے شروع ہو [illegible] گھر [illegible] مفید [illegible] گیا

جس وقت مسلمان ہندوستان میں آئے اس وقت [illegible] آج جو مسلمان جو ہندوستان میں نظر آتے ہیں [illegible] طبقہ اعلیٰ کے لوگ قدرتاً اپنے آبا و اجداد کے رسم [illegible] تمدن کا [illegible] رکھ۔ نچلے طبقہ کی عورتوں نے برقعوں کا استعمال شروع کیا [illegible] حجاب [illegible] کیلئے باندھ رہا ہیں مسلمانوں میں اعلیٰ و ادنیٰ کا امتیاز نہیں [illegible] ہندوستان میں [illegible] تاہم جو طبقہ ہندوستان میں ادنیٰ کہلاتا ہے اس کی عورتوں نے برقعہ نہیں [illegible] جدید [illegible] قومی ضروریات ہمیں سبق سکھا رہی ہیں اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ طبقہ اعلیٰ کی [illegible] عورتیں بھی [illegible] سے باہر نکل رہی ہیں [illegible] خصوصاً نوجوان تعلیم یافتہ [illegible] پھیلتی جاتی ہے۔ عورتوں میں بیداری پیدا ہو رہی ہے [illegible] پڑتی ہوئی ہیں۔

٭ نبی کریم کی ازواج مطہرات کے پردہ سے متعلق [illegible] قرآنی کی [illegible] دوسرے مضمون میں تشریح کی گئی ہے۔ مصنف

لفظ سے کی تائید ہوتی ہے۔ مزید برآں قرآن مجید نے حکم دیا ہے کہ عورتوں کو کسب معیشت اور تحصیل ضروریات کے لئے باہر نکلنا جائز ہے۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ مسلمان ہمیشہ جہاد میں عورتوں کو لے جاتے تھے اور انہیں مجروحین اور بیماروں کی تیمارداری کے وہی فرائض انجام دینے پڑتے تھے جو آج کل صلیب احمر و ہلال احمر سیوا سمتی جیسی انجمنیں انجام دیتی ہیں۔ خود نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں عورتیں جہاد میں ساتھ جاتی تھیں۔ ام عطیہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ مختلف جہادوں میں سات مرتبہ گئیں اور حضور کی زوجہ مطہر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور قبائل ام سلیم و انصار کی اکثر خواتین جہاد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جاتی تھیں (صحیح مسلم)

غزوہ خندق میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے ایک یہودی کو نہایت ہی جرأت سے قتل کیا اس غزوہ میں ام عمارہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جان بچائی (سیرۃ الصحابیات صفحات ۴۰۔ ۵) گبن نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ زوال روما" میں میدان ازدین کی جنگ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ جس میں ابان کی زوجہ نے حصہ لیا۔ یہ خاتون اپنے شوہر کے ہمراہ جہاد میں گئی تھیں جہاں ابان کو ایک شخص مسمی طامس نے قتل کر دیا۔ خاتون مذکورہ نے اپنے شوہر کا انتقام لینے کی قسم کھائی اور طامس پر حملہ کر کے مجروح بھی کیا۔ تاریخ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں خواتین نماز پڑھنے مسجدوں میں جایا کرتی تھیں اور آج بھی اکثر ممالک میں اس کا رواج ہے۔

رائٹ آنریبل سید امیر علی نے لکھا ہے کہ خاندان عباسیہ کے دسویں فرمانروا خلیفہ متوکل کی تخت نشینی کے زمانہ تک عورتوں کو غیر معمولی آزادی حاصل رہی ..... اس زمانہ تک والدین اپنی لائق و فائق اور حسین و جمیل لڑکیوں کا نام اپنے نام میں شامل کرنے پر فخر کرتے تھے اور عشاق اپنی محبوبہ کا نام لے کر میدان جہاد میں کارہائے نمایاں کرتے تھے (تاریخ عرب صفحہ ۲۰۰) مشہور مصنف ابوطیب ابوالفضل یحییٰ ایک مرتبہ مکہ معظمہ سے واپس آتے ہوئے ایک

جزو بن کر رہ گئی۔ انسان عورت پر مختار کل تھا اور جس طرح جمادات نباتات وحیوانات سے وہ کام لیتا تھا اسی طرح عورت پر بھی حکمراں تھا۔ دیگر اشیاء کی طرح اس کی خرید و فروخت بھی کی جا سکتی تھی اور زندگی میں عورت کا مقصد صرف اسقدر تھا کہ وہ مرد کو خوش رکھے اور اس کی مدد کرے۔

عجیب بات یہ ہے کہ یہ تخیل بہت دنوں تک قایم رہا اور یونان و روما کی ذہنی و تمدنی ترقیوں میں بھی عورت کا درجہ بلند نہ ہوا۔ یونانی عورتیں گھر کی چار دیواریوں میں بند عموماً خانہ داری میں منہمک رہیں، اور روما نے علوم و فنون اور ترقی و تمدن کو بام عروج تک پہنچانے کے باوجود عورت کو قعر مذلت و گمنامی سے باہر نہیں نکالا۔ اس میں شک نہیں کہ رومن شعراء نے عورت کی صورت و سیرت کی تعریف میں اشعار کہے لیکن ان کی اصل خوبی بچوں کی درشت و پرداخت پر مبنی رہی۔ حکومت روما نئی نئی فتوحات کے شوق میں صلح سے گریزاں اور جنگ میں پیش قدمی کرتی رہی اور اس کی وسیع سلطنت اور دور افتادہ ممالک کی حفاظت کے لئے اس بات کی ضرورت تھی کہ طاقتور اور بہادر سپاہی پیدا ہوتے رہیں جو سخت سے سخت دشمن کو بھی زیر کر سکیں۔ چنانچہ روما کی حکومت کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہاں کی مائیں تنومند و صحیح الجثہ بچے پیدا کریں اور حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ عورت کو صرف اسی حیثیت سے دیکھا جائے کہ وہ مستقبل کے سپاہیوں کی ماں ہے۔ لڑکیوں کی طفولیت میں قدر نہ تھی اور کمزور بچیاں تو پہاڑوں پر سے ڈھکیل کر مار ڈالی جاتی تھیں۔ سلطنت روما کے انتہائی عروج کے زمانہ میں جب قیصر اوغسٹس فرمانروائی کرتے تھے عورتوں کی حیثیت کچھ بہتر ہوئی مگر اس وقت بھی ان کی کوئی جداگانہ ہستی نہ بنی اور نہ عام معاشرت کی تشکیل میں ان کا کوئی حصہ رہا بلکہ جو کچھ قدر ان کی ہوئی وہ مردوں کی دلچسپی کیلئے آلۂ کار کی حیثیت سے۔

مسیحیت جس نے یورپ کے ظلمتکدہ میں روشنی کی کچھ جھلک پہنچائی۔ اس میں عورتوں کے حقوق ایک حد تک تسلیم کئے گئے اور یہ تعلیم دی گئی کہ "اگر کوئی شخص مرجائے اور اس کے اولاد نرینہ نہ ہو تو اس کا ترکہ اس کی لڑکی کو ملے گا"۔ لیکن اس ترکہ کی ملکیت آج تک باوجود تمامتر ترقیوں کے تسلیم نہیں کی گئی اور اس وقت بھی شادی کے بعد بیوی کی جائیداد شوہر کی جائداد میں مدغم ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسیحی تعلیم کی بنیاد یہ ہے کہ عورت انسان کے سب سے پہلے قصور کی ذمہ دار ہے اور سینٹ پال جیسے مبلغین اسے سوسائٹی

عورت کی حیثیت ہندوستان میں

ہندو مسلم ذہنیت کے لحاظ سے

قدامت پسند لوگوں کی چیخ پکار کے علی الرغم دنیا بھر میں عورتیں ترقی اور آزادی کی طرف تیزی سے بڑھ رہی ہیں۔ جو لوگ پرانے زمانے کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہیں وہ تو اسے کسی طرح برداشت نہیں کر سکتے کہ عورتیں بھی مردوں کی برابری کا دعوے کریں۔ لیکن زمانے کی رفتار کو روکنا ان کے بس میں نہیں ہے۔ زمانہ گزشتہ میں عورتوں کے ساتھ جو بے انصافی اور بدسلوکی ہوتی رہی ہے اس کا احساس عورتوں میں ضرورت سے زیادہ قوی ہو گیا ہے۔ اور اب یہ مردوں سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اپنے حقوق و مطالبات کے لئے جد و جہد کر رہی ہیں۔ حالات اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ حقوق نسواں کے سخت ترین مخالفین بھی انھیں کچھ نہ کچھ حقوق دینے پر تیار ہو گئے ہیں اور بہت سے حقوق جو پہلے نہ نہیں آتے تھے اب واضح اور معین طور پر سامنے آ گئے ہیں۔ کچھ دنوں سے تو نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ جو عورتیں پہلے گھر کی چار دیواریوں میں بند رہتی تھیں اب وہ اپنے طبقہ کے لئے مساوات و حریت کے مطالبے میں سب سے آگے ہیں۔ ان کے حقوق و مطالبات کا یقین کرنے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ان کی ترقیوں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ان کی مساعی کی وسعت کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔

تاریخ پیشین کے صفحات کی ورق گردانی سے پتہ چلے گا کہ جب بنی نوع انسان کا کوئی مذہب تھا اس وقت عورتوں کی حیثیت بھی بہت ادنی تھی اور یہ مردوں سے متعلق ہو کر خلوت کی زندگی بسر کرتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں جبکہ انسان عقل و خرد میں اتنا یگانہ نہ تھا۔ معاشرت کا بنیادی اصول قوت کی حکومت تھی اور مرد اپنی قوت و شہ زوری کے زعم میں دنیا کی دیگر مخلوقات کا آقا بن بیٹھا تھا چنانچہ عورت کو اپنی ہستی نمایاں کرنے کا کبھی موقع نہ ملا اور وہ زیادہ سے زیادہ مرد کے عملہ خانہ داری کا ایک

اُن کی لڑکیوں کی شادی تقریباً ناممکن ہوتی ہے اور آئے دن ایسے قصے سننے میں آتے ہیں کہ پڑھی لکھی ہونہار لڑکیوں نے والدین کے افلاس کی وجہ سے یا اس بار سے سبکدوش کرنے کے خیال سے خودکشی کرلی اور عام طور پر لڑکی کا گھر میں ہونا ایک وبال جان سمجھا جاتا ہے۔ منو نے یہ بھی کہہ دیا کہ عورت کا جائیداد میں مطلق حصہ نہیں ہے اور نہ اُسے اپنے والدین یا اعزہ کا ترکہ مل سکتا ہے۔ لڑکی کی اگر کوئی ذاتی آمدنی ہے تو شادی سے قبل باپ کی اور بعد شادی شوہر کی ملکیت ہوگی۔ اگر کوئی شخص لاولد فوت ہو تو بھی اس کی بیوہ کو صرف حین حیاتی حق متوفی کی جائیداد پر حاصل ہوتا ہے اور یہ مطلق اختیار نہیں ہے کہ اس کا کوئی حصہ کسی دوسرے کو دیدے۔ بیوہ عورت کی حالت معاشی [illegible] سے اور بھی بدتر تھی اور عام طور پر وہ ایک منحوس چیز سمجھی جاتی تھی جس کا وجود زمین پر بار تھا۔ بیوہ عورتوں پر مظالم کی انتہا یہاں تک پہنچی کہ ستی کی رسم کی ابتدا ہوئی۔ یعنی ان مظالم کو برداشت کرنے کے بجائے متوفی کی بیوی اپنے شوہر کے ساتھ چتا میں جل مرنے کو ترجیح دیتی تھی اور آخر میں اسی رسم نے یہ شکل اختیار کی کہ بیوہ عورت کو زبردستی دہکتی آگ میں دھکیل دیا جاتا تھا۔ اس بے رحمانہ رسم کے انسداد کی کوشش سب سے پہلے شاہانِ مغلیہ کے دور میں شروع ہوئی مگر [illegible] مذہبی جذبات [illegible] تھے کہ قانونی بندشوں کے باوجود اس کا سلسلہ جاری رہا اور انگریزی حکومت نے ابتدائی دور میں جا کر اس مذہبی رسم کو جرم قرار دے کر قطعاً بند کیا جا سکا تاہم آج بھی اسلامی اور مغربی تمدن کے اثر و نفوذ کے باوجود ہندو معاشرت میں عورت کو واجبی حیثیت حاصل نہیں ہوئی ہے۔ ابھی حال میں مرکزی اسمبلی میں ہندو عورتوں کے حقوق کا ایک قانون پیش ہوا تھا۔ ہندو اس کے لئے نہیں راضی ہوئے کہ ان کی لڑکیوں کو ان کی جائیداد میں حق ملے۔ صرف بیوہ عورتوں کو مثل لڑکوں کے حق دیا گیا ہے۔

عورتوں کی اس تنگ و تاریک دنیا میں حقیقی روشنی [illegible] اسلام نے پیدا کی اور اسلامی تعلیمات ہی کے اثر سے حقوق نسواں کے مطالبے کی تحریک معرض وجود میں آئی۔ واقعہ یہ ہے کہ [illegible] ہشتر عورتوں کے متعلق عربوں کا خیال بھی دوسروں سے زیادہ بہتر نہ تھا اور وہاں بھی لڑکی کا پیدا ہونا بہت برا خیال کیا جاتا تھا لیکن پیغمبر [illegible] نے وحی الٰہی کے بموجب یہ تعلیم دی کہ کوئی قوم ذہنی اور

میں معزز جگہ دینے کیلئے تیار نہیں تھے۔ سینٹ پال نے تو یہاں تک کہا ہے کہ "آدم کو فریب نہیں دیا گیا عورت کو فریب دیا اور وہی گنہگار ہوئی"۔ اسی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ قرون وسطیٰ میں یورپ کے ایک بادشاہ نے اپنی بیوی سے جھگڑا کرتے ہوئے کہا تھا کہ "ملکہ میں نے تمہارے ساتھ اس لئے شادی کی ہے کہ تم میرے بچوں کی ماں بنو اس لئے نہیں کہ تم امور سلطنت میں دخل در معقولات کرو"۔ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے کہ یورپ کے مشہور پرائم منسٹر گلیڈسٹون نے کہا تھا کہ "اے ملکہ! تم بہرحال عورت ذات ہو"۔ ان حالات و واقعات سے یورپین تمدن میں عورت کی حیثیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان میں عورت کی حالت اس سے بھی بدتر تھی اور زمانہ قدیم سے اُسے سرچشمہ بدی سمجھا جاتا تھا رگ وید میں عورت کو "بے لگام ناقابل اصلاح اور نیکی سے عاری" کہا گیا ہے۔ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ لڑکی کا پیدا ہونا خاندان کے لئے مصائب کا پیش خیمہ ہے چنانچہ باپ کا کریا کرم اولاد نرینہ کے ذمہ تھا اور لڑکی اُسے پانی نہیں دے سکتی تھی یہاں تک کہ اگر کسی کے اولاد نرینہ نہ ہو تو کہا جاتا تھا کہ اُسے مرنے کے بعد نجات نہ حاصل ہوں بلکہ وہ دوزخ کی تاریک ترین تہ میں ہمیشہ کے لئے ڈھکیل دیا جائے گا۔ اس طرح سوسائٹی میں عورتوں کی حیثیت بہت ہی ادنیٰ تھی اور منو نے بھی جو ہندو قانون وراثت کا موجد ہے عورت کو کوئی درجہ نہیں دیا۔ موجودہ ہندو معاشرت کی بنیاد منو کے قانون پر ہے اور اس قانون میں گھرانے کی سرپرستی باپ کو سپرد کی گئی ہے اور اسی کی نگرانی میں ناکتخدا لڑکیاں ہوتی ہیں جو شادی کے بعد جزوکل اپنے شوہر کی نگرانی میں ہو جاتی ہیں۔ صغر سنی کی شادی بھی ضروری تھی اور منو نے کہا ہے کہ نیس سال کے مرد کو یا رہ سال کی لڑکی سے شادی کرنی چاہیئے اور چوبیس سال کے مرد کو چھ سال کی لڑکی سے۔ صغر سنی کی شادی کا رواج اتنا عام ہو گیا کہ جو باپ اپنی لڑکی کو بچپنے میں نہ بیاہ دے وہ برادری میں مطعون ہوتا تھا۔ شادی کی بیڑیاں ایک دفعہ پیر میں پڑ جانے کے بعد پھر ٹوٹ نہیں سکتی تھیں اور اس کے مرد کو تعدد ازدواج کی بلا قید اجازت تھی اور ہے۔ طلاق یا بیوہ کی شادی یہ ایسے خیالات ہیں جو اس وقت بالکل ناپید تھے۔ پہلے زمانہ میں لڑکے والے لڑکی والے کو عقد کا نقد معاوضہ دیتے تھے پھر لڑکی والوں کی طرف سے دینے کا دستور رائج ہوا جو آج بھی بنگال و مدراس میں سختی سے برتا جاتا ہے اور جو والدین نقدی نہیں فراہم کر سکتے

اسلام کی اس تعلیم سے بہت دور ہٹ گئے ہیں اور مقامی رواج و دستور کو اسلامی شرع پر ترجیح دے کر عورتوں کو اُن کے جائز حق وراثت سے محروم کر رکھا ہے۔ مثلاً بمبئی کے بوہرے، اودھ کے تعلقہ دار پنجاب کے عام مسلمان لڑکیوں کا حق اسلامی شریعت کے مطابق نہیں دیتے۔ ۱۹۳۷ء کے گرمائی اجلاس مرکزی مجلس قانون ساز میں ایک مسودہ قانون پاس ہوا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کی جو حق تلفی ہو رہی ہے وہ رفع کی جائے اور انھیں وراثت میں مقررہ شرعی حصہ ملنے لگے۔ اس قانون کے عمل سے زرعی املاک کو اس لئے خارج کرنا پڑا کہ یہ صوبہ جات کی حکومت کے دائرہ اختیار میں ہے۔ امید ہے کہ صوبہ جات کی حکومتیں بھی اپنے اپنے صوبہ میں ایسے قوانین نافذ کردیں گی جو زرعی املاک پر بھی حاوی ہوسکیں اور اس طرح مسلمان عورتوں کو ترکہ میں ان کا شرعی اور جائز حق ملنے میں جو رکاوٹیں رسوم و رواج نے ڈال رکھی ہیں وہ دور ہوجائیں۔

واقعہ یہ ہے کہ شخصی حیثیت سے ایک مسلمان عورت کو مذہباً جتنی آزادی حاصل ہے وہ دنیا بھر میں کسی دوسری قوم کو حاصل نہیں ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں وہ اپنی جداگانہ ہستی رکھتی ہے اور مغربی ممالک کی عورت کی طرح شادی کے بعد شوہر کی شخصیت میں مدغم نہیں ہوجاتی۔ اسلامی قانون کے بموجب عورت شادی کے بعد بھی اپنی املاک اور کاروبار کی مالک ہوتی ہے اور اس بارے میں انصرام امور کے لئے شادی سے اُس پر کسی قسم کی قید نہیں ہوتی۔ یہ ہے وہ مساوی حق جو اسلام کی ایک امتیازی خصوصیت ہے اور کسی دیگر قوم میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اسلامی قانون کے بموجب عقد ایک معاہدہ ہے جو دیگر معاہدات کی طرح فریقین کی مرضی پر منسوخ کیا جاسکتا ہے اور کوئی مذہبی بندش ایسی نہیں ہے جو ایک عورت کو کسی مرد سے اس طرح وابستہ کردے کہ کسی طرح اور کسی حالت میں چاہے ساری زندگی تلخ ہوکر رہ جائے الگ نہ ہوسکے۔ شادی کے لئے فریقین کی رضامندی ضروری ہے اور مرد یہ اختیار نہیں رکھتا کہ وہ کسی عورت سے بلا اُس کی مرضی کے عقد کرے یا عقد کے بعد بھی عورت کی مرضی کے خلاف اُسے روکے رہے۔ اس طرح اسلامی قانون میں صغرسنی کی شادی کی گنجائش شاذونادر ہوسکتی ہے کیونکہ اُس کے لئے مثل اور معاہدوں کے ایک اہم قانونی ضرورت کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اور اگر کسی قانونی یا دیگر

تمدنی حیثیت سے اس وقت تک بام عروج پر نہیں پہنچ سکتی جب تک وہ عورتوں کے ساتھ ناانصافی اور عدم مساوات کا سلوک کرتی رہے گی۔ آپ نے نہایت ہی شد و مد کے ساتھ اس عام خیال کی تردید کی کہ عورتیں بدی کا سرچشمہ ہیں بلکہ اس کے برعکس قرآن نے پکار پکار کر اعلان کیا کہ عورتیں مردوں کا لباس ہیں اور مرد عورتوں کا اور پھر نبی کریمؐ نے مسلمانوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ "تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنی بیوی بچوں سے بہتر سلوک کرے"۔ قرآن پاک نے اولاد ذکور و اناث کا امتیاز یک قلم مٹا دیا اور کہہ دیا کہ "اللہ ہی جسے چاہتا ہے لڑکی دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے لڑکا دیتا ہے"۔ اس معاشرتی اصلاح کے ساتھ ساتھ وراثت کے قانون میں بھی اسلام نے ایک انقلاب عظیم پیدا کیا اور سب سے پہلے جائیداد میں عورت کے معین مالکانہ حقوق کو تسلیم کیا۔ قرآن میں ارشاد ہے کہ، "مردوں ہی کی طرح عورتوں کے بھی پسندیدہ حقوق ہیں"۔ یہی نہیں بلکہ ترکہ کی تقسیم ایسے واضح اور بین اصول پر کی اور اس طرح ہر حصے کی حدیں مقرر کر دیں کہ اس سے پیشتر ان چیزوں کا وجود نہ تھا اور آج بھی دنیا کی تمام ترقیوں کے باوجود جو کوئی متمدن ملک اپنے یہاں کے قانون وراثت کی اصلاح کرنا چاہتا ہے تو اسے روشنی اور ہدایت کے لئے اسلامی تعلیم ہی کی طرف جانا پڑتا ہے۔ اسلام نے لڑکی کا حصہ لڑکے سے نصف رکھا ہے اور اسے ظاہر بین لوگ مساوات کے خلاف سمجھتے ہیں لیکن ذرا تامل کرنے سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ باپ کے ترکہ میں اس حصے کے علاوہ شوہر کے ترکہ میں بھی اس کا حصہ مقرر ہے اور اس کے سارے اخراجات کی ذمہ داری شوہر کے سر عائد کی گئی ہے پھر اسی شوہر کو گھر کے سارے انتظامات اور بچوں کی پرورش تعلیم و تربیت وغیرہ کے سارے اخراجات کی کفالت کرنی پڑتی ہے اور اس لحاظ سے ترکہ میں اس کا بمقابلے عورت کے دوگنا حصہ مطرح حق بجانب اور مبنی بر انصاف ہے۔ علاوہ بریں باپ کو بذریعہ وصیت دو بہ اس تقسیم میں فرق کا اختیار بھی دیا گیا ہے اور اس قاعدے کا فائدہ لڑکوں کی طرح لڑکیوں کو بھی پہنچتا ہے۔

لیکن اسلامی قانون کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ عورت کو جو حصہ دیا گیا ہے وہ پورے مالکانہ اختیارات کے ساتھ دیا گیا ہے جو خرید و فروخت ہبہ اور وصیت کیا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسا مرد اپنی جائیداد کے متعلق کر سکتا ہے۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے بعض فرقے

نظر آ رہی ہیں اور دوسری طرف مجالس قانون ساز و قومی تحریکات میں ان کے افراد کی تعداد روز افزوں ہے یہ عورتوں ہی کی چیخ و پکار کا نتیجہ تھا کہ عمر رضامندی کا قانون پاس ہوا اور اب عورتوں کی معاشی سطح بلند کرنے کے لئے دیگر اسی قسم کے قوانین کے نفاذ کا تقاضا کیا جا رہا ہے۔ سیاسی حقوق طلب کرنے میں بھی ہندوستان کی عورتیں دیگر ممالک سے پیچھے نہیں ہیں اور ۱۹۱۷ء میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات کی تشکیل کے وقت جو صدا بلند ہوئی تھی وہ ۱۹۳۴ء کی جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کے سامنے پوری قوت اور استحکام کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔ یہ علامات بہتری کے ہیں اور اگر حالات کی رفتار یہی رہی تو ہمیں یقین رکھنا چاہیئے کہ اس ملک کی خواتین بحیثیت خواتین کے معاشرت و سیاست میں وہ رتبہ و حیثیت حاصل کر لیں گی جس کی وہ مستحق ہیں اور آج کل جبکہ دنیا کی سیاسیات میں ہر طرف جنگ جنگ کی صدائیں آ رہی ہیں اور موجودہ تمدن قیام امن عالم کے مسئلہ کو اپنی قطعی شکست مان چکا ہے۔ اس بات کی ضرورت ہے کہ اس فضا میں ایک ایسا عنصر شامل ہو جو جنگ کو امن سے، فساد کو سکون سے، بے اطمینانی کو اطمینان سے اور خلفشار و اختلال کو یکسوئی و اتحاد سے بدل دے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جس عنصر کا ہمیں انتظار ہے وہ عورت کی ذات میں ملے گا؟ دیکھیں آگے کے واقعات کیا دکھاتے ہیں مگر غالباً ہماری یہ توقع بے جا نہ ہوگی کہ مستقبل عالم کی پر امن تشکیل میں ہندوستانی خواتین کا حصہ نمایاں ترین اور درخشاں ترین ہوگا۔

مصلحت سے اس کی ضرورت ہی لاحق ہو جائے تو لڑکی کو یہ پورا پورا اختیار دیا گیا ہے کہ سن بلوغ کو پہنچ کر وہ اگر اس عقد کے خلاف ہو تو طلاق لے لے۔ اسی سلسلے میں مہر کا ذکر بھی بے سود نہ ہوگا۔ جس کا اصل مقصد یہ ہے کہ مرد پر ایک طرح کی قید اور ذمہ داری رہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بیوی کو طلاق دینے کے لئے آمادہ نہ ہو جائے۔ مہر کا روپیہ بیوی کی ملکیت ہے اور اس کا حق کسی حالت میں شوہر کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ اگر مہر ادا کیا گیا ہو تو شوہر کی جائیداد پر بیوی کے مہر کا بار دوسرے تمام باروں سے مقدم ہوتا ہے۔ مگر اس میں بھی بدقسمتی سے ہندوستانی مسلمانوں نے رواج و دستور کی تقلید کر کے اس کے اصل مقصد کو ضائع کر دیا اور نتیجہ یہ ہے کہ مہر کا مقرر کرنا اور اس کا ادا کرنا یہ سب ایک ڈھکوسلہ بن کر رہ گیا ہے اور اکثر اس سلسلے میں ایسی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں کہ مہر کا سارا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

زمانہ حال کے مفکرین یورپ و امریکہ عقد و طلاق کے مسائل کو حل کرنے میں اس طرح اُلجھے ہوئے ہیں کہ کوئی راستہ یا روشنی انھیں نظر نہیں آتی ہے۔ کیا میں ان کی خدمت میں عرض کر سکتا ہوں کہ ان کے لئے راستہ اور روشنی دونوں اسلامی تعلیم میں ملیں گے اور جب تک یہ اس طرف توجہ نہ کریں گے اس وقت تک منزل سے ہٹتے اور روشنی سے دور ہوتے چلے جائیں گے۔ میں ہندوستان اور سارے دنیا کے معاشی اصلاح کرنے والوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ صرف نکاح اور طلاق ہی نہیں بلکہ عورت کے بارے میں ہر اہم و غیر اہم پیچیدہ و غیر پیچیدہ مسئلے کا حل مکمل اور معین طور پر اسلامی تعلیمات کے سوا کہیں اور نہیں پا سکتے اور حقوق نسواں کی تحریک کی تقویت و ترقی یا زمانہ حال کی ضروریات کی تشفی کا سامان قابل اطمینان طور پر قرآن کریم کے سوا کہیں اور نہیں مل سکتا۔

اور یہ بالکل صحیح ہے کہ اسی اسلامی تعلیم کے اثر نے تحریک نسواں کو تقویت پہنچائی۔ چنانچہ آج اسی کی بدولت عورت کے سر چشمہ بدی ہونے کا خیال قصہ پارینہ ہو گیا اور ہر جگہ عورتیں مردوں کے برابر حقوق ہر شعبہ زندگی میں حاصل کرنے کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ خود ہندوستان میں جہاں ترقی کی رفتار ہر چیز میں بہت سست رہی ہے عورتوں کے معاملہ میں دیگر ممالک کے دوش بدوش ترقی ہوئی ہے اور ایک طرف تو وکیل بیرسٹر، ڈاکٹر سرکاری و غیر سرکاری ملازم غرضکہ ہر جگہ جہاں مرد کام کرتے ہیں آج عورتیں بھی کام کرتی

(۱) الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ (حدیث شریف)

(ترجمہ) تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کی عیال ہے۔ اللہ مخلوق میں سب سے زیادہ اُسے پسند کرتا ہے جو اس کے عیال کے ساتھ سب سے اچھا سلوک کرتا ہے۔

(۲) قیامک مع اخیک ساعۃ خیر من اعتکاف سنۃ (حدیث شریف)

(ترجمہ) کسی انسانی بھائی کی خدمت کی خاطر تمہارا اس کے ساتھ ایک منٹ کا قیام تمہارے ایک برس کے اعتکاف سے بہتر ہے۔

(ج) نبی کریم کو صرف خدا کا رسول تسلیم کرنا۔ درحقیقت محمد رسول اللہ کا لفظ کلمہ کا جزو اسلئے قرار دیا گیا ہے کہ ہم لوگ بہک کر آپ کے معاملہ میں افراط و تفریط سے کام نہ لینے لگیں۔ قرآن کریم میں ہے۔

اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوْحٰی اِلَیَّ اَنَّمَا اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ (۱۸ — ۱۱۵)

(ترجمہ) میں صرف تمہاری طرح ایک انسان ہوں۔ ہاں میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔

نبی کریم نے فرمایا کہ جس طرح اور قوموں نے اپنے نبیوں کی پرستش شروع کر دی ہم لوگوں کو ایسا نہ کرنا چاہیئے۔ حدیث کے الفاظ میں لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ عیسیٰ بن مریم الخ۔ مجھے اس طرح حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم (علیہم السلام) کو حد سے بڑھا دیا۔ انی لا ارید ان ترفعونی فوق منزلتی انزلنیھا اللہ تعالیٰ الخ۔ (ترجمہ) مجھے اللہ کے عطا کئے ہوئے مرتبہ سے زیادہ نہ بڑھاؤ۔

(د) ذات اور رنگ وغیرہ کے امتیازات بیچ سمجھنا چاہیئے۔ قرآن میں ہے۔

وجعلنا کم شعوبًا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم ط

(ترجمہ) اور ہم نے تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ تم میں سے اللہ کے نزدیک معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ خدا اور خلق خدا کی خدمت کرتا ہو۔

مندرجہ بالا آیت کے بموجب فرقوں اور قبیلوں کے امتیازات کی وہی حیثیت ہے جو دروازوں پر نمبروں کی ہوتی ہے۔ فی الحقیقت اسلام میں ذات، مسلک یا رنگ کا امتیاز نہیں ہے۔ نبی کریم

پیامِ اسلام

آج کل پیام کی فرمائش کرنا عام دستور ہوگیا ہے، مگر ایک مسلمان کو کسی نئے پیام کی ضرورت نہیں ہمارے لئے نبی کریم صلعم کا لایا ہوا پیام ایک ایسا جامع و مانع نظام عمل ہے جو ہر عہد کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ یہ پیام قرآن کریم ہے۔ جس کی تکمیل نے ہماری ہدایت کے نظام کی تکمیل کر دی ہے۔ قرآن میں ہے الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔

(ترجمہ) آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا اور میں نے تمہارے لئے دین اسلام کو پسند کیا۔

قرآن کریم کی تعلیم کے بموجب اسلام کے بنیادی اصول یہ ہیں :۔

(ا) خدا کو واحد جاننا۔ قرآن میں ہے۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝

(ترجمہ) کہو اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس کا کوئی بیٹا ہے۔ اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہے نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔

جو لوگ سمجھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ خدا سے پیدا ہوئے تھے ان کے لئے اس کمیشن کی رپورٹ کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔ جو ۱۹۲۲ء میں آرچ بشپ آف کنٹربری نے عیسائیت کے اصول کی تحقیقات کی غرض سے مقرر کیا تھا اور جس کی رپورٹ ابھی حال میں شائع ہوئی ہے۔

(ب) اعتراف اس امر کا کہ تمام مخلوق خدا کی عیال ہے اور اس کی خدمت اسلام کے خصوصی اصول میں سے ہے۔

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب اور ارأیت الذی یکذب بالدین
ایسی ہی منظم زندگی کی تعلیم دیتی ہیں جو ان اصولوں پر مبنی ہوں۔

(ص) مذہبی رواداری اسلامی تعلیمات کا جوہر ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

(۱) لا اکراہ فی الدین (۲ : ۲۵۶)

(ترجمہ) دین میں کوئی زبردستی نہیں

(۲) لکم دینکم ولی دین (۱۰۹ : ۶)

(ترجمہ) تمھارے لئے تمھارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین ہے

(۳) نحن اعلم بما یقولون وما انت علیھم بجبار فذکر بالقرآن من یخاف
وعید (۵۰ : ۴۵)

(ترجمہ) ہم خوب جانتے ہیں جو وہ کہتے ہیں اور تم ان پر جبر کرنے والے نہیں ہو۔ تم قرآن سے اس کو سمجھاؤ
جو میری وعید (تنبیہ) سے ڈرتا ہے۔

جو سماج ان اصولوں پر کاربند ہو، جہاں ہر شخص اپنے اپنی قوم کے دین، تہذیب، ثقافت میں آزاد ہو، وہاں کسی کو خوف
نہ ہونا چاہیے۔ سچ تو یہ ہے کہ جو قوم ان اصولوں پر کاربند ہوگی وہ ہمیشہ سربلند رہے گی۔

نے مسلسل اپنی زندگی میں اس اصول پر عمل کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی کے ساتھ قبیلہ یا نسل یا جماعت کی بنا پر برتاؤ میں تفریق روا رکھی گئی ہو۔ اس کے برخلاف آپ نے مسلمانوں کو مساوات کی عملی تعلیم دی اور غلاموں اور بلند درجہ کے لوگوں کے درمیان شادی کا رواج پھیلایا۔ مثلاً حضرت بلالؓ کی شادی جو آپ کے غلام تھے قبیلۂ قریش کی لڑکی سے، اور دوسرے حضرت زیدؓ کی شادی آپ کی پھوپھی کی لڑکی حضرت زینبؓ کے ساتھ ہوئی تھی۔

(۷) مسلمانوں میں نفاق و افتراق کو گناہ کبیرہ سمجھنا۔

قرآن کریم ان لوگوں سے علیحدہ رہنے کی تاکید کرتا ہے جو گروہ بندی کریں اور آپس میں اختلاف بڑھائیں۔

ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا لست منھم فی شیء (۶ - ۱۶۰)

(ترجمہ) وہ لوگ جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور گروہ گروہ ہو گئے۔ تیرا ان سے کوئی سروکار نہیں۔

یہاں مسجد ضرار کے واقعہ کا ذکر کرنا نامناسب نہ ہوگا۔ مدینہ کے مضافات میں قبا کے مقام پر ایک پرانی مسجد تھی جہاں عام طور پر مسلمان جمع ہوتے تھے۔ کچھ لوگوں کو اس مسجد کی ہر دلعزیزی سے حسد پیدا ہوا اور انھوں نے یہ اور مسجد تعمیر کرائی اور نبی کریم سے اس کا افتتاح کرانا چاہا۔ اس تعمیر کے متعلق آپ کو بذریعۂ وحی معلوم ہو گیا کہ یہ مسجد مسلمانوں میں افتراق کا باعث ہوگی تو آپ نے صرف مسجد کے افتتاح سے انکار کر دیا، بلکہ کچھ مسلمانوں کو بھیجکر مسجد منہدم کرا دی۔

(۸) اسلام۔ وزمرہ کی زندگی میں صداقت اور پاکبازی پر زور دیتا ہے۔ قرآن کریم میں اخلاق، اتحاد، انصاف، ایفائے عہد اور ایثار وغیرہ کے اوصاف پیدا کرنے کا بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ درحقیقت ایثار کا درجہ تو اس قدر بلند ہے کہ مسلمانوں کو عید الاضحیٰ کے موقعہ پر حضرت ابراہیمؑ کی مثال کی یاد دہانی ہر سال کی جاتی ہے اور ہدایت ہے کہ قربانی کا فریضہ ایسی خوش اسلوبی سے ادا کیا جائے کہ دوسرے کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے تاکہ وہ بھی ہماری تقلید کریں۔ وہ آیتیں جن کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:-

مصنفِ "یدِ بیضا" کی چند دیگر تصانیف

[illegible] عالم [illegible] مشہور و معروف متمدن ممالک [illegible]
[illegible] مونٹرز [illegible] امریکہ سویٹ [illegible]
[illegible] اردو زبان میں پوری تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ اس سے پہلے اردو میں کوئی کتاب [illegible]
[illegible] لکھی گئی۔ ہندوستان میں جمہوریت کا آغاز ہو جانے کی وجہ سے ضرورت ہے [illegible]
[illegible] ہندوستان کی مرکزی و صوبائی مجالس آئین ساز سے وابستہ ہیں [illegible]
[illegible] فائدہ اٹھائیں۔ (زیرِ طبع ہے عنقریب شائع ہو جائے گی) ✦ قیمت فی جلد [illegible]

[illegible]اقِ ہند اس کتاب میں حکومت برطانیہ کی ابتدا سے گورنمنٹ آف انڈیا [illegible]
ہندوستان میں جو آئینی تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کی پوری تاریخ [illegible]
[illegible] تفصیل ہے۔ وفاقی حکومت میں برطانوی ہند اور ریاستوں کے جو تعلقات رہیں گے ان [illegible]
[illegible] پہنچائی گئی ہیں۔ قانون سے دلچسپی لینے والے خصوصاً مرکزیا صوبجات میں اس قانون سے [illegible]
[illegible]ت کے لئے یہ کتاب ایک صحیح رہنما ثابت ہوگی۔ اس موضوع پر اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جو نہایت [illegible]
زبان میں لکھی گئی ہے۔ قیمت (عہ)

دونوں کتابیں اردو لٹریچر کمپنی دہلی سے مل سکتی ہیں ✦

[illegible]ش لائٹس آن اسلام FLASH LIGHTS ON ISLAM

[illegible] "یدِ بیضا" کی طرح اس کتاب میں بزبان انگریزی [illegible]
[illegible]رتی مضامین ہیں جنمیں بعض تو وہی ہیں جو "یدِ بیضا" میں ہیں اور بعض ان سے مختلف ہیں [illegible]
[illegible]ن ایسا ہے جو "یدِ بیضا" والے مضمون سے بہت زیادہ وسیع اور پُر معلومات ہے [illegible]
[illegible] بعض نئے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قیمت ۸ر ✦

آرمی پریس شملہ

تاریخ لامعہ

۵۷ ھ ۱۳

از قلم احسن رقم سید حبیب احمد اُفق کاظمی

۱۹ ۶ ۳۸

آں نجم سپہر ادب و حکمت و دانش — مشہور زماں جعفری فاضل و دانا
کز حسن تقاریر و تحاریر بلیغش — پُر زیب مُجلات و مجالس بہمہ جا
مجموعۂ جذبات و خیالاتِ بلندش — مطبوع شد امروز بنام "یدِ بیضا"
تاریخ طباعت اُفق از روشنیٔ طبع! — گفتیم بہ ہجری و مسیحی چہ مُجلاّ
آمد "متکلم یدِ بیضا" پے ہجری
۵۷ ۱۳
وز بہرِ مسیحی است "ظہور یدِ بیضا"
۱۹۳۸ء

معذرت

اس کتاب کی طباعت عجلت اور عدیم الفرصتی میں ہوئی ہے۔ اس لئے بعض مضامین میں چند روایات کی جو تکرار تھی وہ حذف کرنے سے رہ گئی۔ اُمید ہے کہ ناظرین کرام اس فروگزاشت سے چشم پوشی فرمائیں گے۔

شکریہ یہ کتاب پریس میں بغرض طباعت جا چکی تھی جب مولوی سید حبیب احمد صاحب اُفق کاظمی امروہوی شملہ تشریف لے گئے اور انہوں نے پروف کی تصحیح میں دلچسپی لیکر مجھے تقریباً اس کام سے سبکدوش کر دیا لہذا میں آخر میں اُن کی اس تکلیف فرمائی کا شکریہ ادا کرتا ہوں +

"جعفری"

علمائے کرام مشاہیر ملک و مقتدر اخبارات وغیرہ کی آرا دیکھئے

حقیقتِ حج

مؤلفہ و مصنفہ

(خانصاحب حاجی) محمد منظور علی بن تائب مالک آرمی پریس شملہ

اردو زبان میں اپنی جامعیت کے لحاظ سے فریضۂ حج اور ارکانِ اسلام کے متعلق

سب سے بہتر اور پہلی کتاب ہے

جس کا مقدمہ خان بہادر علامہ ڈاکٹر سید نجم الدین صاحب جعفری ایل ایل ڈی ڈی لٹ نے تحریر فرمایا ہے

حقیقتِ حج میں ارکان اسلام یعنی (توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ و حج) پر بھی فلسفیانہ انداز میں بہتر سے بہتر طریق پر روشنی ڈالی گئی۔

حقیقتِ حج میں حج کے متعلق ہر جزئی سے جزئی امر پر اس قدر وضاحت سے بحث کی گئی ہے کہ آجتک ایسی جامع دیکھنے میں نہیں آئی۔ حج اور سفرِ حج کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا گیا +

حقیقتِ حج میں حج کی فرضیت فلسفۂ حج سفرِ حج خشکی و بحری راستے اور ان کے متعلق دیگر حکومتوں کے قوانین معلومات و تخمینہ اخراجات غیرہ کے علاوہ حجاز عراق شام فلسطین مصر ترکی ایران افغانستان کے زیارتوں کے حالات بھی درج

اگر آپ کا ارادہ اس مقدس فریضہ کے ادا کرنے کا ہو تو

سب سے پہلے حقیقتِ حج کا مطالعہ ضرور کریں۔

کتاب کا حجم ۵۰۰ صفحہ ہے اور قیمت اس قدر کم ہے کہ اس سے سستی کتاب آجتک کہیں نہیں مل سکتی +

قیمت معمولی کاغذ اور کپڑے کی سلائی بغیر تصاویر ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصولڈاک

" جزدبند سلائی معہ ۶۰ ہاف ٹون بلاکس دو روپے (عہ) "

" ولایتی چکنا کاغذ " چار روپے (للعہ) "

منیجر آرمی پریس شملہ یا سول ملٹری پریس حسن علی آفندی روڈ **کراچی** سے طلب کریں